دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۵ ماہ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۱۰ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات ۸۲
عمیر الصدیق ندوی

مقالات

قرآن عظیم اور انسان کی اصل حقیقت ۸۵
جناب مولانا سعید الرحمان ندوی

شیخ محمد الغزالی ۱۱۰
پروفیسر ایس کفیل احمد قاسمی

مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۱۲۱
کلیم صفات اصلاحی

اخبار علمیہ ۱۴۱
ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

مکتوب نئی دہلی ۱۴۴
جناب بدر الدین الحافظ

مکتوب لکھنؤ ۱۴۷
مولانا سلمان الحسینی ندوی

مکتوب علی گڑھ ۱۴۸
جناب ثاقب صدیقی

مکتوب قاہرہ ۱۵۰
جناب صاحب عالم

باب الاستفسار والجواب

تعلیم القرآن ۱۵۱
ک، ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر ۱۵۳
توقیر احمد ندوی

ادبیات

غزل ۱۵۶
جناب وارث ریاضی صاحب

مطبوعات جدیدہ ۱۵۷
ع۔ص

اشتہار۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۶۰

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

اسلامی ہند کی تاریخ میں صوبہ گجرات کی سرزمین کو بعض ایسی اولیات حاصل ہیں جن سے یہ خطہ واقعی دارالخیرات کہلانے کا مستحق رہا، یہ اعزاز اسی کو حاصل ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد مبارک میں خیر القرون کے پاکباز قدموں کے نشان بھروچ کی زمین کو میمنت لزوم کرگئے، ۱۵ھ میں والی بحرین حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ اور ایک روایت کے مطابق ان کے بھائی حضرت حکم بن ابی العاصؓ، گجرات کے ساحلی شہر بھروچ تشریف لائے اور گندھار میں اس مسجد کی تعمیر کی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں یہ پہلا خدا کا گھر تھا، اس قافلہ انفاس قدسیہ میں وہ ہستیاں یقیناً تھیں جن کی آنکھیں دیدار نبویؐ سے مشرف تھیں، ہندوستان کی اس خوش قسمتی کے متعلق مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا تھا کہ ''اس لحاظ سے ہندوستان بھی ان خوش قسمت ملکوں میں ہے جن کی خاک صحبت یافتگان نبویؐ کے پانوں سے لگ کر ہماری آنکھوں کا کحل الجواہر بن چکی ہے'' سرزمین گجرات اپنی اس قسمت پر ہمیشہ ناز کرسکتی ہے کہ عرب اور ہندوستان کو ایک کرنے کی سعادت بھی اسی کے فرزندوں کے نصیب میں آئی، نویں صدی ہجری کے آغاز میں سلطان گجرات احمد شاہ اول نے عرب و ہند کے درمیان گجرات کو سلسلۃ الذہب بنادیا اور اس تعلق کا سب سے خوب صورت اور دلآویز ثمر، علم حدیث کی تخم ریزی کے نتیجے میں ظاہر ہوا، بحر عرب کے اس پار کی یہ مبارک شعاعیں سب سے پہلے گجرات پر پڑیں اور بقول حضرت سید صاحبؒ ''یہاں سے وہ آگرہ کی مسجدوں اور مدرسوں کے مناروں پر عکس انداز ہوئیں''۔

حضرات عثمانؓ و حکمؓ سے شروع ہونے والی اس داستان میں حضرت حسن بصریؒ، نورالدین شیرازی، راجح بن داؤد، وجیہ الدین محمد مالکی، علاء الدین احمد نہروالی، ابن عمر حضرمی، عبدالمالک عباسی شاگرد سخاوی، شیخ علی متقی، ملا محمد بن طاہر فتنی جیسے غیر معمولی اہل فضل و کمال کی ایک کہکشاں ہے جس نے گجرات کی زمین کو ہم رتبۂ افلاک بنادیا، یہ تو محض چند اسمائے مشاہیر ہیں ورنہ مفسرین و محدثین، فقہاء و ادباء اور علماء و صلحاء کی کثرت ایسی ہے کہ گجرات کے لیے دارالخیرات سے بہتر کوئی اور تعبیر نظر نہیں آتی، یہ اتفاق بھی عجب حسن رکھتا ہے کہ علم حدیث کی خدمت میں گجرات کی برکت، بیرون گجرات کے لیے مسلسل عام رہی، عبدالاول حسینی جون پوری سے مولانا تقی الدین ندوی تک اس کی متعدد مثالیں ہیں،

علامہ حسینی جون پوری اگر بخاری شریف کے پہلے ہندوستانی شارح ہیں تو مولانا ندوی صحیح بخاری کے مستند ترین نسخے کے جامع ہیں۔

علم و فضل کی یہ قابل رشک دولت گذشتہ صدی کے آغاز تک کم از کم اردو داں طبقے کے لیے کنز مخفی ہی تھی، غالباً سب سے پہلے اسلامی ہند کے ابن خلکان مولانا سید عبدالحیؒ ناظم ندوۃ العلماء نے یاد ایام کے نام سے گجرات کے رخ روشن سے پردہ اٹھایا، یہ مختصر کتاب گرمتن کے درجہ میں تھی تو اس کی مفصل شرح کی سعادت دارالمصنّفین کی قسمت میں آئی، سید صاحبؒ نے ہندوستان میں علم حدیث کے زیر عنوان اس داستان کا آغاز کیا، بعد میں مولانا سید ابوظفر ندوی نے تاریخ گجرات اور گجرات کی تمدنی تاریخ لکھ کر ہندوستان پر سرزمین گجرات کے احسانوں کا گویا قرض اتارا، ان کتابوں سے پہلی بار اردو دنیا گجرات کے صاحب سیف و سنان سلاطین کے ساتھ علم و قلم کے ان کے تاج داروں سے واقف ہوئی جن کے فیض سے پورا ہندوستان سیراب ہوا، اس کے علاوہ معارف کے مدیر اول سید صاحبؒ نے بار ہا شذرات میں گجرات سے والہانہ تعلق کا اظہار کیا، کبھی بڑودہ کے مدارس و مکتبات کا فخریہ ذکر کیا اور کبھی درگاہ پیر محمد شاہ کے کتب خانے کی ترتیب جدید کے لیے مولانا ابوظفر ندوی کی کوششوں کی یہ کہہ کر حوصلہ افزائی کی کہ ''مولانا اور ارکان کی یہ کوشش ہے کہ گجرات کا تمام اندوختہ سلف اس میں سمٹ کر آجائے''، کبھی گجرات کے علوم و فنون، خانقاہوں اور کتب خانوں کی یاد کے ساتھ یہ جملہ آہ بن کر نکلا کہ ''علم تو اب وہاں نہیں رہا''۔ اس علم کی بازیابی میں دارالمصنّفین اور معارف کا بھی الحمدللہ کچھ حصہ ہے، عبدالعزیز میمنی کی معرکۃ الآراء تصنیف ابوالعلاء معری دارالمصنّفین نے عرب سے چھپوا کر شائع کی تو معارف کے صفحات کا دامن گجرات کے اہل قلم کے لیے تنگ نہیں رہا، مولانا محمد سورتی، پروفیسر سید نواب علی اور قاضی اختر جوناگڑھی وغیرہ کی نگارشات معارف کے ذریعہ عام ہوئیں، گجرات سے سید صاحب کی محبت ان کو بڑودہ، بھروچ، راندیر، سورت، انکلشور اور ڈابھیل تک کشاں کشاں لے گئی اسی سفر میں جب وہ بھروچ میں دریائے نربدا کے کنارے کھڑے ہوئے، تخیل کی آنکھوں نے تیرہ سو چھتیس برس پہلے کی تصویریں نگاہوں کے سامنے کر دیں تو جذبات کے تلاطم نے ایک ترانے کی شکل اختیار کر لی، آخری شعر سب کچھ کہہ گیا کہ

چشم عبرت کی نگاہیں جب تری جانب اٹھیں تیری موجیں کہنہ افسانوں کی سطریں بن گئیں

گردش ماہ و سال کا قدرتی غبار، حد سے نہ گزر جائے اور قصہ پارینہ طاق نسیاں کی نذر نہ ہوجائے، اسی مقصد سے رابطہ ادب اسلامی (برصغیر) نے اس دلکش ترین حکایت کی بازخوانی کے لیے بھروچ کے قصبہ جمبوسر کو مذاکرۂ علمی کے لیے منتخب کیا، مقصد عنوان سے واضح تھا کہ ''مولانا محمد بن طاہر پٹنی و دیگر علمائے گجرات اور ان کی ادبی و علمی خدمات'' اس مذاکرۂ علمی کی برکت تھی کہ اقلیم سلیماں دارالمصنّفین کے ایک مورناتواں کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ بھی بھروچ کی اسی خاک کو اپنی آنکھوں سے لگائے جس کے ذرے صحابہ کرامؓ کے نقوش پا کی برکت سے ہمیشہ روشن رہیں گے، سمینار میں اور سمینار سے باہر بھروچ کے باشندوں پر نظر اس حسرت سے پڑی کہ خدا جانے ان میں کتنے اسلام کے پہلے قافلہ نفوس زکیہ کی یادگار ہیں، مولانا سید محمد رابع ندوی کی دل نواز قیادت اور ان کے رفقائے گرامی مولانا سعید الرحمان اعظمی اور مولانا واضح رشید ندوی وغیرہ کی رفاقت میں ہندوستان میں ادب اسلامی کے احیاء اور فروغ کے پاک جذبے کی برکت تھی کہ بیرون گجرات کے نمایندوں سے کہیں زیادہ تعداد گجرات کے تازہ اہل قلم کی تھی، مولانا مفتی احمد خان پوری، مولانا یعقوب قاسمی، مولانا عبداللہ کاپودروی اور میزبان مکرم مفتی احمد دیولوی کی پراثر تقریروں نے ایک بار پھر دارالخیرات گجرات کی برکات کو مجسم کردیا، دل نے یہی کہا کہ اسّی سال کے مدوجزر نے گجرات کو پھر اس مقام پر لا دیا ہے جہاں یہ شکوہ باقی نہیں رہتا کہ ''اب علم وہاں نہیں رہا''

گجرات کے اس مختصر سفر کو بڑودہ کے نزدیک کبھی کے محمد آباد اور اب چاپانیر کی زیارت نے بھی یادگار بنادیا، احمد آباد کے فارسی فاضل ڈاکٹر زبیر قریشی کی محبت وعنایت نے اس چاپانیر سے روشناس کرایا جس کا چپہ چپہ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا چشم دید گواہ ہے، کوہستانوں اور بیابانوں کو مسجدوں اور منبروں سے آراستہ کرنے والی قوم نے قرطبہ وغرناطہ سے احمد آباد اور محمد آباد تک فردوس برروئے زمین کے کیسے کیسے حسین مرقعے تیار کردیے، چاپانیر کی جامع مسجد، نگینہ مسجد اور کیوڑہ مسجد، خدا جانے اپنے ماضی سے ہمارے حال کا اندازہ کرسکیں یا نہیں، ہم دم بخود سید صاحبؒ کی زبان میں صرف یہی کہہ سکے کہ

تو تیائے چشم ظاہر آج تیری خاک ہے ذرہ ذرہ پرتو خورشید ذی لولاک ہے

سلیم

مقالات

قرآن عظیم اور انسان کی اصل حقیقت

جناب مولانا سعید الرحمان ندوی*

(۳)

حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں جو منکرین کی مسلسل شقاوت کا بیان ایک دوسرے اسلوب میں اس طرح کرنے والی ہیں:

حَتّٰی إِذَا جَآءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ۔ لَعَلِّیْٓ أَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا، إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا، وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ إِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (مؤمنون: ۹۹-۱۰۰)	یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آئے گی تو وہ کہنے لگے گا اے میرے رب مجھے لوٹا دیجئے تا کہ میں جسے چھوڑ آیا ہوں اس میں صالح عمل کرلوں، (اس پر اسے کہا جائے گا) ہرگز نہیں، یہ محض ایک بکواس ہے جسے وہ کئے جا رہا ہے، جب کہ قیامت تک ان کے آگے ایک آڑ حائل رہے گی۔

یہاں موت کے وقت ہر منکر پر طاری ہونے والی کیفیت اور اس کی جانب سے عمل صالح کے لئے ایک اور موقع کی التجا رَبِّ ارْجِعُوْنِ۔ لَعَلِّیْٓ أَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ (اے میرے رب مجھے لوٹا دیجئے تا کہ میں جسے چھوڑ آیا ہوں اس میں صالح عمل کرلوں) کا بیان ہو رہا ہے۔ اب اس پر باری تعالیٰ کی جانب سے جو جواب دیا جا رہا ہے اس پر غور کیا جائے۔ چنانچہ كَلَّا،

---

* ناظم، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور۔

إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا (ہرگز نہیں، یہ محض ایک بکواس ہے جسے وہ کئے جارہا ہے) سے بہت ہی واضح طور پر ظاہر ہے کہ یہ جواب الٰہی اس کے دنیا میں لوٹائے جانے کی نہیں بلکہ اس کے یہاں لوٹ کر عمل صالح کرنے کی نفی کرنے والا ہے کہ اس کی یہ تمنا محض بکواس اور سراسر جھوٹ پر مبنی ہے، اور یہ کہ یہ آگے بھی اسی ہٹ دھرمی پر قائم رہنے والا ہے، جیسا کہ شمارہ ۲۴ کے تحت اس طبقے کی جانب سے يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبُ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (کاش ہمیں واپس لوٹا دیا جائے، اور ہم اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور مومنوں میں سے ہو جائیں) کی التجا کے جواب میں وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (اور اگر انہیں واپس لوٹا دیا جائے تب بھی وہ وہی کرنے لگیں گے جس سے وہ منع کئے گئے تھے، یقیناً وہ جھوٹے ہی ہیں) کے ذریعے بخوبی ثابت کیا جا چکا ہے۔ اسی لئے اس مفہوم کو مزید موکد و مضبوط کرتے ہوئے اس کے متصل بعد وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (جب کہ ان کے آگے قیامت تک ایک آڑ حائل رہے گی) کے ذریعے پیش گوئی کی جارہی ہے کہ منکرین کو صرف ایک اور زندگی ہی کیا بلکہ قیامت تک جتنی ساری بھی زندگیاں عطا کی جائیں گی ان سب میں بھی ان کی آنکھوں پر پردہ اور ان کے آگے ایک آڑ حائل رہے گی، اور وہ کبھی بھی ایمان کی دولت سے سرفراز نہیں ہو سکیں گے، جیسا کہ خود ان کی موجودہ زندگی میں ان کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے اور نتیجتاً ان کے عدم صلاحیت ایمان کا بیان دیگر مواقع سے بھی کیا گیا ہے، مثلاً:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ، وَعَلٰٓى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (بقرۃ:۷)

اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ۔ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (یٰس:۹-۱۰)

ہم نے ایک آڑ ان کے آگے کر دی ہے اور ایک آڑ ان کے پیچھے بھی کر کے انہیں ڈھانک دیا ہے، سو وہ دیکھ نہیں سکتے ہیں۔ اب آپ انہیں ڈرائیں یا نہ بھی ڈرائیں دونوں برابر ہی ہیں، وہ ایمان نہیں لے آئیں گے۔

بَــرْزَخٌ کے لفظی و حقیقی معنے دو چیزوں کے درمیان حائل ہونے والی چیز کو کہتے ہیں۔ لہذا یہ مذکورہ بالا آیات میں واقع ہونے والے غِشَــاوَۃٌ اور سَــدٌّ کا مترادف ہی ٹھہرتا ہے۔ اس کا استعمال قرآن مجید میں حسب ذیل دو اور مقامات پر بھی اور ہر جگہ اس کے اسی لفظی معنے ہی میں ہوا ہے:

وَهُوَ الَّـذِیْ مَـرَجَ الْبَـحْرَیْنِ هٰذَا عَـذْبٌ فُـرَاتٌ وَّهٰـذَا مِـلْحٌ أُجَـاجٌ، وَجَـعَـلَ بَیْـنَهُـمَا بَرْزَخًـا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا (فرقان: ۵۳)

وہی ہے جس نے دو دریاؤں کو باہم ملا دیا، ایک شیریں اور خوشگوار ہے اور ایک نمکین اور تلخ، اور ان دونوں کے درمیان اس نے ایک آڑ اور ایک مضبوط رکاوٹ بنادی ہے۔

مَـرَجَ الْبَـحْـرَیْـنِ یَلْتَقِیٰنِ۔ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ (رحمٰن: ۱۹- ۲۰)

اس نے دو دریاؤں کو باہم ملایا کہ وہ آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک آڑ بھی ہے، جس سے وہ تجاوز نہیں کرتیں۔

اس وقت یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ متقدمین نے یہاں (بَــــرْزَخٌ) سے اس کے اصطلاحی معنے ''عالم برزخ'' مراد لے کر ان آیات سے انسان کی صرف ایک ہی دنیوی زندگی پر استدلال کیا تھا، جب کہ اوپر سے چلی آ رہی ہماری منظم و مربوط گفتگو کی روشنی میں اور ''الـقـرآن یـفسر بعضه بعضا'' کے مطابق یہی آیات حقیقی طور پر تعدد تخلیق انسانی و جمع بین السماوات کا ایک نہایت عبرت انگیز پہلو پیش کرنے والی ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اسی لئے موجودہ منکرین کی بابت دیگر مقامات پر بھی کہا گیا ہے کہ دین حق سے ان کی موجودہ عداوت اور گمراہی حالیہ نہیں بلکہ بہت دور کی اور بہت ہی قدیم ہے:

بَـلِ الَّـذِیْـنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِــی الْـعَـذَابِ وَالـضَّـلٰلِ الْبَعِیْدِ (سبا: ۸)

در اصل جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لے آتے ہیں وہ عذاب میں اور دور دراز کی (یعنی قدیم) گمراہی میں مبتلا ہیں۔

وَإِنَّ الـظّٰـلِمِیْنَ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ (حج: ۵۳)

بے شک ظالم لوگ دور کی (یعنی قدیم) عداوت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اب ہمارے مراد لئے گئے اس مفہوم کی مزید تاکید وتوضیح کے لئے حسب ذیل آیات شریفہ بھی ملاحظہ ہوں:

وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّآ أَنْ قَالُوا ائْتُوا بِاٰبَآئِنَآ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ (جاثیہ: ۲۵-۲۷)

جب ان پر ہماری واضح نشانیاں پڑھی جارہی ہیں تو ان کے پاس اس قول کے علاوہ اور کوئی بھی دلیل نہیں ہوتی ہے کہ اگر تم سچے ہوتو ہمارے آباواجداد کو لے آؤ۔ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تم سب کو بھی زندہ ہی کررہا ہے، پھر وہ تمہیں موت دے گا، پھر قیامت تک جماتا بھی رہے گا، جس میں کوئی شک نہیں، لیکن اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے۔ آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے، اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن اہل باطل خسارے میں ہوں گے۔

یہاں پہلی آیت میں کفار کے اس سوال پر کہ اگر رسول اکرمؐ اپنے دعوے میں سچے ہوں تو بطور معجزہ ان کے اپنے باپ داداؤں کو زندہ کر دکھائیں ان کو جواب دیا جارہا ہے کہ اللہ تعالی ہر ایک کو بھی زندہ ہی کررہا ہے، جن میں صرف ان کے اجداد ہی نہیں بلکہ خود وہ بھی شامل ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ ان سب کو قیامت تک کئی مزید مرتبہ زندہ کر کے مختلف مقامات پر جمع بھی کرتا رہے گا۔ پھر (وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ) خبر دے رہا ہے کہ اکثر لوگوں کو ان کے اس جمع بین السماوات کا علم نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ یہ سب کچھ بغرض ابتلا وآزمائش غیر شعوری طور پر ہی ہورہا ہے۔ اس طرح اس ضمن میں شمارہ ۲۴ کے تحت کئے گئے ہمارے استدلال کی تائید میں ایک اور نص صریح فراہم ہوجاتی ہے۔(۱)

قیامت تک جمع کئے جاتے رہنے کے فوری بعد (وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ) سے ایک اور مرتبہ اشارہ مل رہا ہے کہ یہ جمع کئے جانے کی جگہیں دیگر آسمانی زمینیں

(۱) مندرجہ بالا مفہوم کے لیے یہ کیا واقعی نص صریح ہے؟ (معارف)

ہی ہوتی ہیں۔ نیز یہاں بھی اور سابقہ شمارے میں بھی (إِلٰـى يَـوْمِ الْـقِيٰـمَةِ) کے مجازی معنے ''قیامت میں'' مراد نہ لئے جانے کی ایک اور دلیل خود موجودہ شمارے کی متصل اگلی ہی آیت میں وَيَـوْمَ تَـقُـوْمُ الـسَّـاعَـةُ (جس دن قیامت قائم ہوگی) کی شکل میں موجود ہے۔ چنانچہ اگر پہلے فقرے میں ''قیامت میں'' تسلیم کرلیا جائے تو دوسرا فقرہ ''جس دن قیامت قائم ہوگی'' مہمل اور بے معنی ٹھہر جائے گا۔ نیز یہاں (اٰيٰتُـنَـا بَيِّـنٰـتٍ) کے ذریعے ان منکرین پر واضح خدائی نشانیوں کا پڑھا جانا ہماری مراد کی تائید میں ایک اور اہم دلیل فراہم کرنے والا ہے، جس پر مفصل گفتگو ہم اپنے اگلے مضمون میں کرنے والے ہیں۔ اب انسان کے اس فلسفہ تعدد تخلیق وجمع بین السماوات کی حقیقت ونوعیت پر مزید روشنی حسب ذیل چار شمارات کے ذریعے سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے:

سَبَّـحَ لِـلّٰـهِ مَـا فِـى السَّمٰـوٰتِ وَالْأَرْضِ، وَهُـوَ الْـعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، يُحْيٖ وَيُـمِيْـتُ، وَهُـوَ عَلٰـى كُلِّ شَـىْءٍ قَـدِيْـرٌ. هُـوَ الْأَوَّلُ وَالْاٰخِـرُ وَالـظَّـاهِـرُ وَالْبَـاطِنُ، وَهُوَ بِكُلِّ شَـىْءٍ عَـلِيْـمٌ. هُـوَ الَّـذِىْ خَـلَـقَ السَّـمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِىْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُـمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ، يَعْلَمُ مَا يَـلِـجُ فِى الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَـا يَـنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَـا، وَهُـوَ مَـعَـكُـمْ أَيْـنَمَا كُنْتُمْ، وَالـلّٰـهُ بِـمَـا تَـعْـمَـلُـوْنَ بَصِيْـرٌ (حدید: ۱-۴)	آسمانوں اور زمینوں میں جو کوئی بھی ہے وہ اللہ ہی کی تسبیح بیان کرتا ہے، اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔ سارے آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت اسی کی ہے، جو زندہ بھی کرتا ہے اور موت بھی دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر بھی ہے۔ اول، آخر، ظاہر، باطن سب وہی ہے، اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ وہی ہے جس نے چھ دن میں سارے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کی، پھر عرش پر استوا فرمایا۔ وہ سب جانتا ہے جو کوئی زمینوں میں داخل ہو رہا ہے اور جو کوئی ان سے نکل رہا ہے، اور جو کوئی آسمانوں سے اتر رہا ہے اور جو کوئی ان میں چڑھ رہا ہے، اور تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ہی ساتھ ہے، اور تم جو کچھ بھی کر رہے ہو اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے۔

ان آیات میں مسلسل تین مرتبہ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ کی ترکیب سے اور پھر چھ دن کی تخلیق اور اس کے بعد استوائے الٰہی سے بھی لازم آتا ہے کہ یہاں سارے آسمانوں اور ان میں موجود ساری زمینوں پر مشتمل خدائی بادشاہت کا روح پرور وخیرہ کن بیان ہو رہا ہے۔ یہاں بتایا جارہا ہے کہ کوئی چیز زمینوں میں داخل ہو رہی ہے تو کوئی ان سے خارج بھی ہو رہی ہے۔ اسی طرح آسمانوں سے کوئی چیز نازل ہو رہی ہے تو کوئی ان میں چڑھ بھی رہی ہے۔ یہاں ترتیب بیان پر غور کیا جاسکتا ہے کہ ''دخول فی الأرض'' کو ''خروج من الأرض'' پر مقدم رکھا گیا ہے، جب کہ ''نزول من السماء'' کی تقدیم ''عروج إلی السماء'' پر کی گئی ہے۔ اس ترتیب سے بخوبی ظاہر ہو رہا ہے کہ زمینوں میں جو چیز داخل ہو رہی ہے وہی آسمانوں سے نازل ہونے والی ہے، اور جو چیز زمینوں سے خارج ہو رہی ہے وہی آسمانوں میں چڑھنے والی ہے۔ مگر وہ کیا چیز ہے لفظاً اس کی تصریح موجود نہیں ہے۔ لیکن اس بیان کے فوری بعد وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ (تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے) کے ذریعے نہایت بلیغ طور پر یہ اشارہ کیا جارہا ہے کہ اس سے مراد ہم انسان ہیں۔ یعنی ہر زمین کی مخلوق کو دیگر آسمانی زمینوں میں جمایا اور بسایا جارہا ہے۔ مثال کے طور پر ہماری موجودہ زمین پر جنہیں خلعت وجود سے نوازا جارہا ہے وہ مختلف آسمانی زمینوں سے وارد ہو رہے ہیں، اور اسی طرح یہاں کی سابقہ معدوم شدہ نسلوں کو منتشر طور پر دیگر الگ الگ کائناتی زمینوں میں پہنچایا جارہا ہے۔ اس طرح ہر زمین کی نئی مخلوق متعدد زمینوں کی سابقہ مخلوقات کا مجموعہ ٹھہرتی ہے۔ اس وقت خصوصیت کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ کائنات کی ہر زمین کے حق میں دیگر ساری زمینیں ''سَمَاءٌ'' ہی کا درجہ رکھتی ہیں۔ نیز آگے وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (تم جو کچھ بھی کر رہے ہو اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے) سے معلوم ہو رہا ہے کہ مخلوقات کا یہ جمایا جانا زندہ اور مکلّف حالت ہی میں ہو رہا ہے۔ اس طرح موجودہ شمارہ پچھلے دونوں شمارات سے حاصل ہونے والے انسانی فلسفۂ تعدد تخلیق وجمع بین السماوات کو مزید استحکام پہنچانے والا اور اس کی کیفیت پر نئی روشنی ڈالنے والا ہو جاتا ہے۔ (۱)

اب ملاحظہ ہو کہ موجودہ شمارے اور شمارہ ۱۵ کے درمیان تعبیر کی کس قدر تطبیق وہم آہنگی

---

(۱) یہ خیال اب بھی دور از کار ہی ہے۔ (معارف)

پائی جاتی ہے، جس سے ان کے درمیان معنوی مطابقت پر ایک اور دلیل بھی فراہم ہوجاتی ہے۔ ساتوں آسمانوں میں موجود ساری زمینوں کی تخلیق پر دلالت کرنے کے لئے اگر وہاں (وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِیْ سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ) کہا گیا تھا تو یہاں بھی یہی سبق (هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِیْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ) کے ذریعے دیا جارہا ہے۔ پھر ان سب کی تخلیق کا مقصد انسان کی آزمائش قرار دئے جانے کے لئے اگر وہاں (لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا) کہا گیا تھا تو یہاں اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے (يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِی الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا، وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ) کہا جارہا ہے۔ اسی طرح موجودہ شمارے اور شمارہ ۲۱ کے درمیان بھی یگانگت ملحوظ رہے۔ وہاں (تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ) کے ذریعے ساتوں آسمانوں پر محیط خدائی بادشاہی کا جو سبق دیا گیا تھا یہاں بھی ٹھیک یہی سبق (لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ) کے ذریعے دیا جارہا ہے۔ اس طرح موجودہ شمارہ خصوصیت کے ساتھ شمارہ ۱۵ کے اجمال کی ہوبہو تفصیل کرنے والا اور شمارہ ۲۱ میں بیان کردہ حقیقت کو ایک دیگر اسلوب میں بیان کرنے والا ہوجاتا ہے۔ نیز حسب ذیل آیات سے بھی اس مفہوم کو مزید تقویت حاصل ہورہی ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْأَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ، وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ۔ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِی الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا، وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَأْتِيْنَا السَّاعَةُ (سبا: ۱-۳)	ہر تعریف اللہ ہی کے لئے ہے، جس کی ملکیت میں وہ ہر کوئی ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے، اور آخرت میں بھی سب تعریف اسی کے لئے ہے، اور وہ بڑا دانا اور خوب جاننے والا ہے۔ وہ سب جانتا ہے جو کوئی زمینوں میں داخل ہورہا ہے اور جو کوئی ان سے نکل رہا ہے، اور جو کوئی آسمانوں سے اتر رہا ہے اور جو کوئی ان میں چڑھ رہا ہے، اور وہ بڑا رحم کرنے والا اور بہت معاف کرنے والا ہے۔ جب کہ کافر کہتے ہیں کہ قیامت نہیں آئے گی۔

اس ارشاد باری کی تینوں آیات بھی معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے پوری طرح مربوط و پیوست ہیں۔(مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْأَرْض) سے ظاہر ہے کہ پچھلے شمارے ہی کی طرح یہاں بھی کلام کل آسمانی زمینوں میں بسی مخلوقات ہی کے تناظر میں ہورہا ہے۔اسی طرح يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا (وہ سب جانتا ہے جو کوئی زمین میں داخل ہورہا ہے اور جو کوئی اس سے نکل رہا ہے، اور جو کوئی آسمان سے اتر رہا ہے اور جو کوئی اس میں چڑھ رہا ہے) کو ایک اور مرتبہ یہاں بھی دہرایا جارہا ہے۔مگر وہاں مذکور وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ (تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے) کی توضیح یہاں ابتداہی میں لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (اللہ ہی کی ملکیت میں وہ ہر کوئی ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے) کے ذریعے کردی گئی ہے۔ پھراس پر دلالت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی دو صفات الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ (بڑادانااور خوب جاننے والا) بھی لائی گئی ہیں۔(الْحَكِيْمُ) سے خبر دی جارہی ہے کہ سارے آسمانوں اور زمینوں میں انسان کے پھیلائے جانے کے پیچھے بڑی گہری حکمت الٰہی کارفرما ہے۔جب کہ (الْخَبِيْرُ) سے بتایا جارہا ہے کہ باری تعالیٰ اس کائناتی انسان کے ہر ہر امر سے بخوبی واقف ہے۔اوراسی واقفیت اور خبرداری کی بناپر اگلی آیت میں کہا جارہا ہے کہ وہ اس کے مسلسل آسمانی زمینوں سے اتر کر ہر کسی زمین میں جمع ہوتے جانے اور وہاں سے چڑھ کر دیگر آسمانی زمینوں میں جمع ہوتے رہنے کا کامل علم رکھتا ہے۔یعنی پہلی آیت کے آخری لفظ (الْخَبِيْرُ) (خوب جاننے والا) کی وضاحت دوسری آیت کے پہلے ہی لفظ (يَعْلَمُ) (وہ جانتا ہے) کے ذریعے فرماکر دونوں آیات کو معنوی اعتبار سے جوڑا جارہا ہے کہ یہ اترنے اور چڑھنے والی چیز کوئی اور نہیں بلکہ آسمانوں میں پھیلی ہوئی انسانی مخلوقات ہی ہیں۔پھر باری تعالیٰ کی مزید دو صفات الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ (بڑارحم کرنے والا اور بہت معاف کرنے والا) اس سلسلے میں کافی اہمیت کے حامل ہیں، جن سے اس جمع کی غرض وغایت کی تعیین بھی بخوبی ہوجاتی ہے۔جیسا کہ سابق میں گزر چکا انسان کے تعدد تخلیق کے پیچھے بنیادی طور پر یہی حکمت الٰہی کارفرما ہوتی ہے کہ منکرین ومعاندین کو کثرت سے رجوع وانابت کے مواقع فراہم کئے جائیں۔اور یہ خدائے غفور ورحیم کی صفات ''غفاریت'' اور ''رحیمیت'' ہی

کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ وہ ان کے گناہوں سے ہر مرتبہ صرف نظر کرتے ہوئے اور ان کی حالت زار پر رحم کرتے ہوئے انہیں مختلف النوع جگہوں پر متنوع الاقسام زندگیوں سے نواز کر ایمان وایقان کے بکثرت وسائل وذرائع پیدا کرتا جاتا ہے۔ اب ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ شمارے اور شمارہ ۲۷ کے درمیان کس قدر مشابہت پائی جاتی ہے کہ وہاں بھی کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ، لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (اس نے اپنی ذات پر رحمت لازم کر لی ہے، وہ ضرور تمہیں قیامت تک جما تا رہے گا) کے ذریعے جمع کی علت اللہ کی صفت رحیمیت ہی قرار دی گئی تھی۔ اس سے بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ یہاں بھی اسلوب بیان بدل کر اسی جمع کی نوعیت کی توضیح وتشریح کی جا رہی ہے۔ نیز تیسری آیت میں (وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَأْتِيْنَا السَّاعَةُ) میں (و) حالیہ ہے، جس کے ذریعے کفار پر اظہار تعجب کیا جا رہا ہے کہ اس وقت جب انسان کو اس قدر زندگیاں دی جا چکی ہیں اور مستقبل میں بھی دی جائیں گی تو یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قیامت نہیں آئے گی اور انسان دوبارہ پیدا نہیں کیا جائے گا۔ یاد رہے کہ شمارہ ۱۵ میں بھی ٹھیک یہی سبق (وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ) کے ذریعے دیا گیا تھا۔ اس طرح بعثت کا انکار کرنے والوں کے لئے ایک اور مرتبہ یہاں بھی خود ان کی تعدد تخلیق کی دلیل پیش کی جا رہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ. وَأُمْلِيْ لَهُمْ، إِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ. أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا، مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ، إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ. أَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ وَّأَنْ عَسٰى أَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ أَجَلُهُمْ، فَبِأَيِّ	جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ہے انہیں ہم ان کی بے خبری میں درجہ بدرجہ بلند کریں گے۔ اور میں انہیں مہلت دئے جا رہا ہوں، یقیناً میری تدبیر بہت مضبوط ہے۔ کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی کو ذرا بھی جنون نہیں ہے؟ وہ تو صرف ایک صاف صاف ڈرانے والے ہیں۔ کیا انہوں نے آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت میں غور نہیں کیا ہے، اور ان چیزوں میں جنہیں اللہ نے پیدا کیا ہے، اور

حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ	اس میں کہ ممکن ہے ان کی میعاد (بھی) قریب آ
(اعراف: ۱۸۲-۱۸۵)	پہنچی ہو؟ پھر وہ اس (قرآن) کے بعد کس بات
	پر ایمان لے آئیں گے؟

معنوی اعتبار سے ان چاروں آیات کے درمیان بھی نہایت درجہ کا ربط وانضباط پایا جاتا ہے۔" اسْتِدْرَاجٌ " کے معنے " درجہ بدرجہ چڑھانا" ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں منکرین ومکذبین کے درجہ بدرجہ چڑھائے جانے کے بیان کے بعد اس کی علت انہیں ایک مضبوط اور گہری خدائی تدبیر کے ذریعے مہلت دئے جانا قرار دیا جارہا ہے۔ اس سے " اسْتِدْرَاجٌ " کی حقیقت ونوعیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اب منکرین کو مہلت دئے جانے سے کیا مراد ہوسکتا ہے اس کے لئے سابقہ شمارہ اور شمارہ ۲۷ ملاحظہ ہوں، جہاں انسان کے جمع بین السماوات کا سبب ہی اللہ کی صفات رحیمیت وغفاریت قرار دے کر یہ معنویت پیدا کی گئی تھی کہ ان صفات ہی کی بدولت اور ایک گہری حکمت ومنصوبہ بندی کے تحت کفار ومنکرین کے حصول ایمان کی خاطر انہیں بار بار مہلت دی جارہی ہے۔ نیز موجودہ شمارے میں مِنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ (ان کی بے خبری میں) کے ذریعے کہا جارہا ہے کہ منکرین ان کے اس چڑھائے جانے کو نہیں جانتے ہیں۔ ٹھیک یہی حقیقت شمارہ ۲۸ میں بھی وَلٰکِنَّ أَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (لیکن اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے) کے ذریعے بیان ہوچکی ہے کہ جمع بین السماوات کو اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔ چنانچہ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ درجہ بدرجہ چڑھائے جانے سے مراد مسلسل پچھلے چار شمارات سے چلے آرہے اسی فلسفۂ جمع بین السماوات کے تحت انسان کو ایک زمین کے بعد اس کے اوپر والی دوسری زمین اور پھر اسی طرح دیگر زمینیں عطا کیا جانا ہے۔ اسی لئے اس پر آگے أَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ (کیا انہوں نے آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت میں غور نہیں کیا ہے، اور ان چیزوں میں جنہیں اللہ نے پیدا کیا ہے) کے ذریعے علمی دلیل قائم کی جارہی ہے کہ ایک جگہ سے ختم کر کے دوسری جگہ لے جانے کا یہ سلسلہ ساری آسمانی زمینوں میں بسائی گئی مخلوقات کے درمیان بھی پوری شان وشوکت کے ساتھ قائم ودائم ہے۔ اور اسی لئے اس کے فوراً بعد موجودہ انسان سے وَأَنْ عَسٰی أَنْ یَّکُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ أَجَلُهُمْ (کیا

انہوں نے اس میں بھی غور نہیں کیا کہ ممکن ہے کہ ان کی میعاد بھی قریب آ پہنچی ہو) کے ذریعے کہا جارہا ہے کہ جس طرح وہ کہیں اور سے یہاں پہنچا ہے ہوسکتا ہے کہ اس کے یہاں سے بھی ختم ہوکر ایک اور مقام پر پہنچنے کا وقت قریب آ گیا ہو: وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِيْنَ۔ عَلٰى أَنْ نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (اور ہم عاجز نہیں ہیں کہ تم جیسوں کے بدل یہاں لے آئیں اور تمہیں وہاں پیدا کردیں جس کا تمہیں علم نہیں)۔

یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ "اِسْتِدْرَاجٌ" کا یہ سارا بیان منکرین ومکذبین کے خصوص ہی میں ہو رہا ہے۔ مگر جیسا کہ ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں ان کی یہ تخصیص صرف اس لئے ہوتی ہے کہ تعدد تخلیق کا یہ سارا سلسلہ بنیادی طور پر ان ہی کو رجوع وانابت کے پے در پے مواقع فراہم کرنا ہوتا ہے کہ آخرت میں ان کے پاس ان کے کفر وانکار کا کوئی بھی عذر باقی نہ رہ جائے۔ ورنہ اس منصوبہ بندی میں سارے ہی انسان شامل ہیں۔ حسب ذیل آیات سے بھی یہ حقیقت بحسن وخوبی محقق ہو رہی ہے:

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ۔ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ (انشقاق: ۱۹- ۲۱)	یقیناً تمہیں ایک آسمان کے بعد دوسرے آسمان پر چڑھنا ہے۔ پھر کیا سبب ہے کہ وہ ایمان نہیں لے آتے ہیں؟ اور جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے ہیں؟

الفاظ قرآنی سے بخوبی ظاہر ہے کہ یہاں پہلی آیت میں خطاب نوع انسانی سے عمومی نوعیت کا ہے۔ جب کہ دوسری آیت میں لَهُمْ کے ذریعے وہ صرف منکرین سے مخصوص ہے۔ طرز سوال سے ظاہر ہے کہ فَمَا میں "ف" سببیہ ہے۔ لہٰذا ان آیات میں منکرین کو یہ خبر دے کر کہ انہیں ایک طبق کے بعد دوسرے طبق پر سوار ہونا ہے ان سے بطور حیرت یہ سوال کیا جارہا ہے کہ اس کے باوجود یہ کس سبب سے ایمان نہیں لے آتے ہیں۔ اس سوال سے یہ حقیقت بھی مترشح ہو رہی ہے کہ اس سوار ہونے کا تعلق آخرت سے نہیں بلکہ خود دنیا ہی سے ہے، کیوں کہ اسی کی بنیاد پر ان سے ایمان کی توقع کی جارہی ہے۔ اب طَبَقٌ سے کیا مراد ہوسکتا ہے اس کے لئے ہمارے پہلے مضمون میں بیان کردہ حسب ذیل آیت ایک اور مرتبہ ملاحظہ ہو کہ وہاں کس طرح

خود آسمانوں کو ٹھیک اسی سے متصف کر دیا گیا ہے:

أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (نوح: ۱۵)

کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان طبق در طبق پیدا کئے؟

یہاں ساتوں آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر ہونے کی وجہ سے طِبَاقٌ کہا جا رہا ہے، جس کا واحد طَبَقٌ ہے۔ خود امام رازیؒ کی تصریح کے مطابق، جسے حافظ ابن کثیرؒ نے بھی اپنی تفسیر میں نقل فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے نزدیک طَبَقٌ سے مراد آسمان ہوسکتا ہے۔ مگر انہوں نے بطور تاویل یہاں خطاب کو رسول اکرمؐ سے مخصوص مان کر اس سے مراد شب معراج کے موقع سے آپؐ کا ساتوں آسمانوں پر یکے بعد دیگرے سوار ہونا مراد لیا ہے۔ مگر جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے جب خطاب کی نوعیت عمومی ہو تو نہ شان نزول کا کوئی اعتبار ہوتا ہے، اور نہ اسے کسی فرد واحد سے مخصوص کرنے ہی کے کوئی معنے رہ جاتے ہیں۔ اور خود الفاظ قرآنی سے بھی اس تاویل کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی ہے۔ نیز پچھلے شمارے میں منکرین کے درجہ بدرجہ چڑھائے جانے اور موجودہ شمارے میں ان کے طبق بطبق سوار ہونے میں مماثلت بھی قابل غور ہے۔ اسی طرح اس کے باوجود انہیں اگر وہاں فَبِأَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (پھر وہ قرآن کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے؟) کہا گیا تھا تو یہاں بھی فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ (پھر کیا سبب ہے کہ وہ ایمان نہیں لے آتے ہیں؟ اور جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے ہیں؟) کے ذریعے ٹھیک اسی حیرت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح شمارات ۵ اور ۲۷ میں بھی انہیں ایک زندگی میں کفر و انکار کی بدولت اگلی زندگیوں میں بھی ایمان کی دولت سے متمتع نہ ہونے کے لئے بالترتیب مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنٰهَا، أَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ اور اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کہا گیا تھا۔ لہذا ان تمام دلائل و شواہد سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہاں طَبَقٌ سے مراد آسمان ہی ہے، اور یہ کہ ان آیات کے ذریعے فلسفہ جمع بین السماوات ہی کی مزید توضیح و تشریح کی جا رہی ہے کہ انسان کو درجہ بدرجہ زمینوں ہی کی طرح طبق در طبق قائم ساتوں آسمانوں میں بھی یعنی ان میں موجود زمینوں میں یکے بعد دیگرے بسایا اور آزمایا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ

اس وقت ہم سب سے قریبی آسمان سَمَآءُ الدُّنیَا میں ہیں اور بقیہ چھ آسمان اس سے پرے ہیں تو ابھی ہماری مزید پیدائشیں و آزمائشیں ان تمام آسمانوں میں بھی کی جانی باقی ہیں!!(۱) چنانچہ یہ مفہوم ٹھیک وہی ہے جو ۱۴- ۲۲ مسلسل نومختلف النوع شمارات کے ذریعے سے بھی حاصل ہونے والا ہے کہ ساتوں آسمانوں کی ساری زمینوں کی تخلیق خود انسان ہی کی ابتلا و آزمائش کی خاطر کی گئی ہے۔اس طرح یہ شمارہ اُن تمام شمارات کی بھی مزید شرح و تفسیر کرنے والا ہو جاتا ہے۔

لہٰذا یہاں الفاظ قرآنی ناطق ہیں کہ متواتر ساتوں آسمانوں میں پیدا کئے جانے میں عمومی طور پر سارے ہی انسان شامل ہیں تو ضرور مگر اس سارے وسیع و عریض عمل اور عظیم حکمت و منصوبہ بندی کا بنیادی مقصد خصوصیت کے ساتھ منکرین و معاندین کو ہر طرح کی زندگیاں عطا کیا جانا اور ان کی ہر اعتبار سے ابتلا و آزمائش کیا جانا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ اب ہم انسان کے فلسفہء جمع بین السماوات اور ساتوں آسمانوں میں اس کی بکثرت تخلیق و آزمائش اور اس ضمن میں باری تعالیٰ کی جانب سے اختیار کی جانے والی وسیع و عریض اور نہایت منظّم منصوبہ بندی کو سمجھنے کی کوشش کریں گے:(۲)

وَلَـئِنۡ سَأَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡأَرۡضَ لَيَـقُوۡلُنَّ خَلَقَهُنَّ الۡعَزِيۡزُ الۡـعَـلِيۡمُ. الَّذِىۡ جَعَلَ لَكُمُ الۡأَرۡضَ مَهۡـدًا وَّجَـعَـلَ لَـكُـمۡ فِيۡهَـا سُبُلًا لَّعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ (زخرف:۹-۱۰)	اگر آپ ان سے دریافت کریں گے کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ انہیں اسی زبردست ہمہ داں ذات نے پیدا کیا ہے جس نے زمینوں کو تمہارے لئے بچھونا بنایا ہے، اور ان میں تمہارے لئے راستے بھی بنادئے ہیں، تاکہ تم ہدایت پاسکو۔

ملحوظ رہے کہ ان آیات پر تفصیلی گفتگو شمارہ ۱۴ کے تحت کرتے ہوئے یہ ثابت کیا جاچکا ہے(۳) کہ ساتوں آسمانوں کی ساری ہی زمینوں کو ہمارے لئے فرش اور بچھونا بنادیا گیا ہے۔اب یہاں غور کا مقام اس ارشاد ربانی کا آخر فقرہ وَجَـعَـلَ لَكُمۡ فِيۡهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ (اللہ نے ان زمینوں میں تمہارے لئے راستے بھی بنادئے ہیں تاکہ تم ہدایت پاسکو) ہے، جس کے ذریعے ان

---

(۱) مزید پیدائش و آزمائش کے اس حصر کے لیے صراحۃً کوئی دلیل نہیں ۔(۲) سمجھنے اور موکد اصرار میں فرق ہونا چاہیے(۳) ثابت کردینے اور ثابت کرنے کی کوشش کرنے میں جو فرق ہے اس کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔(معارف)

ساری مفروشہ زمینوں کی ایک نہایت اہم خاصیت یہ بیان کی جارہی ہے کہ ان سب میں ہمارے لئے اور خود ہماری ہدایت کی خاطر مختلف راستے بنادئے گئے ہیں۔ چنانچہ صحیفۂ الٰہی میں دیگر مواقع سے ان راستوں کی مزید وضاحت اس طرح آئی ہے:

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا، وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ، أَفَلَا يُؤْمِنُونَ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ، وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ (انبیاء: ۳۰-۳۱)

کیا کفار نے نہیں دیکھا کہ سارے آسمان اور زمینیں آپس میں ملے ہوئے تھے، لہذا ہم نے انہیں جدا جدا کر دیا، اور ہر زندہ چیز کو پانی ہی سے بنایا ہے۔ پھر بھی کیا یہ ایمان نہیں لے آئیں گے؟ اور ہم نے زمینوں میں پہاڑ بنادئے کہ وہ انہیں لے کر لرزنے نہ لگیں، اور ان میں کشادہ راستے بھی بنائے تا کہ وہ ہدایت پاسکیں۔

سابقہ آیات ہی کی طرح موجودہ آیات میں بھی السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ کی ترکیب خبر دے رہی ہے کہ یہاں بھی الْأَرْضُ کا استعمال بطور اسم جنس ہی ہوا ہے۔ نیز وہاں ان زمینوں میں ہدایت انسانی کی خاطر بنائے گئے مخصوص راستوں سُبُلًا کی وضاحت یہاں فِجَاجًا سُبُلًا کے ذریعے کی جارہی ہے کہ حقیقت میں یہ راستے کشادہ ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں خلاف قاعدہ صفت فِجَاجًا کو اس کے موصوف سُبُلًا پر مقدم رکھا گیا ہے، جب کہ نوح: ۲۰ میں راست طور پر سُبُلًا فِجَاجًا کہہ دیا گیا ہے۔ صاحب تفسیر کشاف امام زمخشریؒ جنہیں لغت وادب میں امامت کا درجہ بھی حاصل ہے نے اس فرق تعبیر کو اس طرح حل کیا ہے کہ زیر بحث آیت میں سُبُلًا صفت نہیں بلکہ حال واقع ہو رہا ہے، جس سے اس کے معنے اس طرح ہو جاتے ہیں کہ جب زمینیں پیدا کر کے ان میں راستے بنائے گئے تھے تو اسی وقت انہیں کشادہ بنادیا گیا تھا۔ امام رازیؒ، قاضی بیضاویؒ وغیرہ مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اسی توجیہ کو ترجیح دی ہے۔ اور حقیقت حال بھی یہی ہوسکتی ہے، کیوں کہ یہاں پہلی آیت میں ماقبل قدیم مادے کو چھوڑ کر موجودہ سارے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کے معاً بعد ان میں ان راستوں کے بھی بنائے جانے کا بیان ہو رہا ہے۔ اس طرح یہ آیت سورۂ نوح والی آیت میں پائے جانے والے ابہام کی بھی تبیین کرنے والی

ہے۔ نیز ہماری مراد کو اور زیادہ موکد کرنے کے لئے یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ شمارات ۵ اور ۷ کا تعلق بھی اسی سورۂ انبیاء کے بالترتیب اوائل اور اواخر سے ہے، جس کے وسط سے موجودہ آیات بھی متعلق ہیں، اور خود ان کے بعد كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ کا بیان بھی ہو رہا ہے جسے ہم نے شمارہ ۴ کے تحت بیان کیا ہے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا	وہ جس نے تمہارے لئے زمینوں کو بچھونا بنایا، اور
وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا (طٰہٰ:۵۳)	ان میں تمہارے لئے راستے بھی داخل کئے۔

یہاں بھی الْأَرْضَ کا استعمال بطور اسم جنس ہی ہوا ہے، جس پر ہم نے شمارات ۱۳-۱۴ کے تحت تفصیلی بحث کی ہے۔ چنانچہ یہاں پر استشہاد ساری زمینوں کو ہمارے لئے بچھونا بنادئے جانے کے اعلان کے متصل بعد وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا (اس نے ان میں تمہارے لئے راستے بھی داخل کئے) فقرے سے ہے، جو اب تک ثابت شدہ ان ساری زمینوں میں خود ان کی تخلیق کے وقت ہی باری تعالیٰ کی جانب سے ہدایت انسانی کی خاطر بنائے گئے کشادہ راستوں کی مزید توضیح کرنے والا ہے کہ یہ راستے خود انسان کی جانب سے بنائے گئے ان زمینوں کی اندرونی سڑکیں اور شاہراہیں نہیں ہیں بلکہ یہ حقیقتاً وہ راستے ہیں جنہیں ان میں باہر سے داخل کیا گیا ہے، کیوں کہ سَلَكَ جب بطور فعل متعدی مستعمل ہو تو اس کے حقیقی معنے ''داخل کرنے'' کے آتے ہیں۔ لہٰذا جو چیز کسی دوسری چیز میں داخل کی جائے تو اس کا تعلق خارج ہی سے ہوتا ہے، جیسے:

اسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ (قصص:۳۲)	اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کرو۔
كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ (حجر:۱۲)	اسی طرح ہم اسے مجرموں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں۔
مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ (مدثر:۴۲)	تمہیں کس چیز نے دوزخ میں ڈالا ہے؟

لہٰذا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب جمع بین السماوات کے تحت انسان کو کثرت تخلیق کے ذریعے درجہ بدرجہ ایک زمین سے دوسری زمین پر اور یکے بعد دیگرے ساتوں آسمانوں پر مسلسل چڑھنا ہے تو جس ترتیب و تسلسل سے وہ ان میں پہنچ کر اپنی زندگیاں گزارتا جائے گا یہاں ٹھیک اسی کو ان کے راستے قرار دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہر راستہ مسلسل بہت ساری زمینوں سے ہو کر گزرتا ہے

اور اس سے مختص جملہ انسان ان ساری زمینوں میں بھی اپنی زندگیاں گزارتے ہوئے اپنی منزل مقصود کی جانب صعود کرتے جاتے ہیں۔ نیز راستوں کی تصریح کے موقع پر ہدایت کا ذکر لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (تاکہ تم ہدایت پاسکو) اور لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (تاکہ وہ ہدایت پاسکیں) بھی خاص طور سے ملحوظ رہے کیوں کہ جمع بین السماوات کا سارا فلسفہ ہی اس حکمت عملی و منصوبہ بندی پر مبنی ہے کہ انسان کو ہدایت و رہنمائی اور اصلاح و درستی کے متعدد اور متنوع الاقسام مواقع فراہم کئے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ شمارات ۳۱ اور ۳۲ کے تحت بھی جمع بین السماوات کے ذریعے رشد و ہدایت کے بکثرت مواقع فراہم کرنے کے باوجود منکرین کے ہمہ وقت عدم صلاحیت ایمان پر بالترتیب فَبِأَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (پھر وہ قرآن کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے؟) اور فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ – وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ (پھر کیا سبب ہے کہ وہ ایمان نہیں لے آتے ہیں؟ اور جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے ہیں؟) کے ذریعے نہایت تعجب کا اظہار کیا گیا تھا۔ ذیل کی آیت میں اس فلسفے کو مزید نکھارا جا رہا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ،	یقیناً ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے
وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ	ہیں اور ہم (ان میں بسی) مخلوق سے غافل نہیں۔

(مؤمنون: ۱۷)

طَرَآئِقُ ''طَرِيْقَةٌ'' کی جمع ہے، اور ''سُبُلٌ'' کا مترادف بھی۔ لہذا یہاں بہت ہی واضح الفاظ اور نہایت صریح تعبیر کے ذریعے پتہ چل رہا ہے کہ یہی وہ کشادہ آسمانی راستے ہیں جنہیں ساتوں آسمانوں کی ساری زمینوں میں ہدایت انسانی کی خاطر ان کے باہر سے داخل کیا گیا ہے۔ اس طرح پچھلے مسلسل تین شمارات سے چلا آ رہا ہمارا استدلال بہت زیادہ قوی و مستحکم ہو جاتا ہے۔ اگر چہ کہ سابقہ شمارے کے برعکس یہاں ان راستوں کی ہمارے لئے تخصیص کو معنی خیز طور پر حذف کر دیا گیا ہے، مگر اگلے ہی فقرے وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ کے ذریعے اس محذوف و مقدر کو اعجازی انداز میں ظاہر کیا جا رہا ہے کہ ان راستوں سے مراد ان میں بسی انسانی مخلوق ہی ہے۔ نیز اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو رہی ہے کہ کائنات کی ساری زمینوں کو نوع انسانی کی آزمائش ہی کی خاطر پیدا کئے جانے اور ان سب کو اس کے لئے بچھونا بنا دئے جانے کا یہ مطلب

نہیں کہ ہر ایک انسان کو بالعموم ہر کسی زمین پر بھی زندگی سے نوازا جائے گا، بلکہ اس کے لئے یہ منصوبہ بندی کی گئی ہے کہ کائنات کی ساری زمینوں کو سات کشادہ راستوں میں منقسم کرتے ہوئے ہر انسان کو ان میں سے کسی ایک ہی راستے سے مختص و منسلک کیا گیا ہے۔ اب اگلی آیت ملاحظہ ہو، جہاں ہمارے موجودہ صرف ایک ہی آسمان کو مختلف راستوں والا قرار دیا جا رہا ہے:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (ذاریات:۷) راستوں والے آسمان کی قسم۔

حُبُكٌ "حِبَــاكٌ" کی جمع ہے، جس کے معنے اُس راستے کے ہوتے ہیں جسے ہوا، ریت یا ساکت پانی میں بنادے۔ یعنی یہ راستے حقیقی اور پائدار نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ان کی حیثیت صرف وقتی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ لفظ سابقہ شمارات میں مستعمل سُبُلٌ اور طَـرَآئِقُ دونوں کی بھی تفسیر کرنے والا ہے کہ ان سب کی حقیقت بھی یہی ہے۔ ملحوظ رہے کہ اب تک مذکور چاروں شمارات کے ذریعے جو سات کشادہ راستے ثابت ہو رہے تھے وہ ساتوں آسمانوں پر محیط تھے، جب کہ موجودہ شمارے کے ذریعے ثابت ہونے والے راستوں کا تعلق صرف دنیوی ایک آسمان سے ہے۔ چنانچہ راستوں کی اس دوگانہ تقسیم سے منطقی طور پر بآسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اول الذکر کشادہ راستے ہی بنیادی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں، جب کہ آخر الذکر راستے ان کشادہ راستوں سے صرف پہلے آسمان میں نکلے ہوئے نسبتاً چھوٹے اور ضمنی قسم کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا قرآن حکیم ہمارے اس استدلال کو اور زیادہ مستحکم کرتے ہوئے ان دونوں اقسام کے راستوں کی غرض و غایت اور حکمت و مصلحت کو بھی ایک اور موقع سے اس طرح بیان کرتا ہے:

لِـكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰـكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (مائدہ: ۴۸)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک راستہ اور ایک واضح راستہ بنادیا ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ضرور تمہیں ایک ہی امت بنادیتا، لیکن وہ تمہیں ان میں آزمانا چاہتا ہے جنہیں اس نے تمہیں عطا کیا ہے، لہٰذا تم نیک کاموں میں مسابقت کرو۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ سے ظاہر ہے کہ یہاں خطاب عمومی ہے، جس سے انفرادی طور پر

نوع انسانی کا ہر فرد مراد ہے۔ شِرۡعَةٌ کے لفظی معنے ''راستے'' کے آتے ہیں، جب کہ مِنۡهَاجٌ کا مطلب ''واضح''، یعنی ''کشادہ راستہ'' ہوتا ہے۔ ان دونوں الفاظ کی معنوی تعیین میں دور اول ہی سے کافی اختلاف چلا آیا ہے، اور ان کے تعلق سے آج تک امت کے درمیان کسی ایک معنے پر اتفاق نہیں ہوسکا ہے۔ نتیجتاً ان کی توجیہ میں بہت ساری مجازی تاویلات منقول ہوئی ہیں۔ جب کہ یہ آیت شریفہ اوپر سے چلی آرہی ہماری توجیہ سے پوری طرح ہم آہنگ اور قرآن مجید کے جدید فلسفہ جمع بین السماوات پر یکسر منطبق ہونے والی ہے۔ چنانچہ اس سے یہ نتیجہ بخوبی برآمد ہوتا ہے کہ ہر انسان کے لئے بنائے گئے یہ کشادہ اور معمولی راستے عین وہی ہیں جو سابقہ پانچ شمارات کے ذریعے اس کے لئے آسمانوں میں ثابت ہو چکے ہیں۔ اسی لئے متصل اگلے ہی فقرے میں وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ أُمَّةً وَّاحِدَةً (اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک ہی امت بنادیتا) کہا جارہا ہے کہ باری تعالیٰ کو تمام انسانوں پر اتمام حجت کرنے اور ان پر جزا و سزا کے فیصلے صادر فرمانے کے لئے کائنات کے طول و عرض میں بکثرت زندگیاں عطا کرنے کے بجائے انہیں اکٹھا صرف ایک ہی زندگی عطا کر کے ایک امت بنادینا کافی تھا۔ پھر وَلٰكِنۡ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِيۡ مَآ اٰتٰكُمۡ (لیکن وہ تمہیں ان میں آزمانا چاہتا ہے جنہیں وہ تمہیں عطا کیا ہے) کے ذریعے تعدد تخلیق انسانی و جمع بین السماوات کی بنیادی غرض و غایت کو ایک اور مرتبہ واضح کیا جارہا ہے کہ یہ سارا عمل ایک عظیم اور حکیمانہ خدائی منصوبہ کے تحت رواں دواں ہے کہ انسان کو دنیا میں ہر قسم کی زندگیوں سے آزمایا جاسکے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنے دفاع میں کسی بھی قسم کی حیلہ سازی سے قاصر رہے۔ ذیل کی آیت ان راستوں کی نوعیت پر مزید روشنی ڈالنے والی ہے:

وَلِكُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ، أَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يَأۡتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيۡعًا، إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيۡرٌ (بقرہ: ۱۴۸)	ہر ایک کے لئے ایک رخ ہے جس کی جانب وہ متوجہ ہے، لہٰذا تم نیک کاموں میں مسابقت کرو، تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ سب کو ایک ساتھ لے آئے گا، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

واضح رہے کہ یہ آیت اور اس سے متصل سابقہ دو مزید آیات تحویل قبلہ کے مسلسل بیان کے بیچوں بیچ واقع ہو کر مربوط طور پر ایک دیگر حقیقت کی جانب اشارہ کر رہی ہیں۔ ان دونوں سابقہ

آیات پر گفتگو ہم اپنے اگلے مضمون میں کریں گے۔ فی الحال موضوع بحث صرف موجودہ آیت ہی ہے۔ چنانچہ یہاں لِکُلٍّ خبر دے رہا ہے کہ ٹھیک پچھلے شمارے ہی کی طرح خطاب یہاں بھی انفرادی طور پر نوع انسانی کے ہر فرد ہی سے ہے۔ ضمیر واحد هُوَ سے یہ حقیقت اور زیادہ موکد بھی ہو رہی ہے، کیوں کہ اقرب ہونے کی وجہ سے اس کا مرجع واجبی طور پر کُلٌّ ہی ٹھہرتا ہے۔ لہذا جب ہر فرد کے لئے ایک الگ رخ ثابت ہو رہا ہے تو ظاہر ہے کہ ان آیات کا تعلق اپنے ماقبل یا مابعد سے نہیں ہے بلکہ ان کا وقوع بطور جملہ معترضہ ہی ہوا ہے۔ ہم سابق میں بھی متعدد مقامات پر اس طرح کے استعمالات پیش کر کے صحیفۂ الٰہی کا عظیم علمی اعجاز ثابت کر چکے ہیں۔ اور خود متقدمین کے نزدیک بھی یہ احتمال ضرور موجود ہے۔ چنانچہ اب ہر ایک کے لئے ایک علاحدہ رخ سے کیا مراد ہوسکتا ہے اس کی تعیین کے لئے موجودہ اور سابقہ شمارات کے درمیان حیرت انگیز تعبیری اتحاد و ہم آہنگی بھی ملحوظ رہے، جس سے ان کی معنوی یگانگت کا اشارہ ملتا ہے: متصل پچھلے شمارے میں ہر انسان کے لئے ایک راستہ اور ایک واضح راستہ بنائے جانے کے اعلان کے متصل بعد فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ کہا گیا تھا جبکہ موجودہ شمارے میں بھی ہر شخص کے ایک علاحدہ رخ کی جانب متوجہ رہنے کی اطلاع دینے کے فوراً بعد ٹھیک اسی تعبیر کو ایک اور مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ ملحوظ رہے کہ یہ تعبیر پورے قرآن میں صرف ان ہی دو مقامات پر آئی ہے۔ اسی طرح اگر شمارہ ۲۹ میں انسان کے مختلف آسمانی زمینوں کے درمیان اترتے چڑھتے رہنے کے بیان کے فوری بعد وَهُوَ مَعَكُمۡ أَيۡنَمَا كُنۡتُمۡ (تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے) کہا گیا تھا تو موجودہ شمارے میں بھی ٹھیک یہی اعلان أَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يَأۡتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيۡعًا (تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ سب کو ایک ساتھ لے آئے گا) کے ذریعے کیا جا رہا ہے۔ اس سے بخوبی ثابت ہو رہا ہے کہ یہ تینوں شمارات انسان کے فلسفۂ تعدد تخلیق وجمع بین السماوات کے تحت باہم ایک دوسرے کی تفسیر و توجیہ کر رہے ہیں، اور یہ کہ یہاں وِجۡهَةٌ سے مراد سابقہ شمارے میں بیان کردہ شِرۡعَةٌ اور مِنۡهَاجٌ ہی ہیں۔ چنانچہ حسب ذیل آیت میں راستوں کے اس مفہوم کو اور زیادہ موکد کیا جا رہا ہے:

قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ فَسِيۡرُوۡا فِي الۡأَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ

تم سے قبل بہت سارے راستے گزر چکے ہیں، سو زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ تکذیب کرنے

عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (آل عمران: ۱۳۷) والوں کا انجام کیا ہوا۔

جب اس زمین کی طبقاتی تاریخ میں حالیہ نسل انسانی سے قبل بھی اس طرح کی بہت ساری نسلیں ثابت ہو چکی ہیں، اور یہ بھی گذر چکا ہے کہ انہیں یکے بعد دیگرے کہیں اور سے لا کر یہاں بسانے کے بعد یہاں سے بھی ختم کر کے کہیں اور لے جایا گیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کا تعلق بھی آسمان میں جاری مختلف راستوں ہی سے ہوگا۔ چنانچہ یہاں ٹھیک اسی حقیقت کو قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ کے ذریعے ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس زمین پر ہم سے قبل بھی بہت سارے راستے گزر چکے ہیں۔ واضح رہے کہ سُنَنٌ سُنَّة کی جمع ہے، جس کے معنے ''طریقے'' اور ''راستے'' کے آتے ہیں۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ جس طرح شمارہ ۳۶ کے تحت ہمارے اوپر سات راستے بنائے جانے کا تذکرہ کرنے کے بعد ان میں بسی مخلوق کی جانب وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ (اور ہم مخلوق سے غافل نہیں) کے ذریعے اشارہ کیا گیا تھا اسی طرح یہاں بھی اس زمین سے ہو کر گزرے ہوئے سابقہ راستوں میں بسی مخلوق پر فَسِيْـرُوْا فِـي الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (سو زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ تکذیب کرنے والوں کا انجام کیا ہوا) کے ذریعے دلیل قائم کی جا رہی ہے کہ انہیں یہاں زندگی سے نواز کر خود ان کی تکذیب کی پاداش میں نیست و نابود کیا جا چکا ہے۔

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو رہی ہے کہ ایک زمین سے ایک ہی راستہ نہیں بلکہ بہت سے راستے گزرتے ہیں۔ ان آسمانی راستوں کی تعبیر کے لئے الفاظ سُبُلٌ، طَرَآئِقُ، حُبُكٌ، شِرْعَةٌ، مِنْهَاجٌ، وِجْهَةٌ اور سُنَنٌ کا تنوع بھی ملحوظ رہے کہ قرآن حکیم کس حکمت سے ہر جگہ ایک ہی مفہوم کی تعبیر کے لئے قصداً الگ الگ ہم معنی الفاظ کا انتخاب کرتا ہے تاکہ معانی کا ظہور قبل از وقت ممکن نہ ہو۔ کتاب الٰہی ایک اور موقع سے اور ایک دیگر پیرایۂ بیان میں ان راستوں کی تقسیم پر نہایت اعجازی انداز میں اس طرح روشنی ڈالنے والی ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا، كُلٌّ فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ وَ	زمین میں کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ پر نہ ہو، اور وہ اس کے زیادہ رہنے اور کم رہنے والی دونوں جگہوں کو جانتا ہے، یہ سب کچھ

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّکَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا، وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّکُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (ہود:۶-۷)	ایک کتاب روشن میں موجود ہے، وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق چھ دنوں میں اس وقت کی جب کہ اس کا عرش پانی پر تھا تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ عمل کے لحاظ سے تم میں سب سے اچھا کون ہے۔ اب اگر آپ ان سے کہیں کہ موت کے بعد تمہیں اٹھایا جائے گا تو کفار کہہ اٹھیں گے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے۔

یاد رہے کہ اس شمارے کی آخری آیت کا تعلق شمارہ ۱۵ سے ہے، جہاں اس کے ذریعے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ ساتوں آسمانوں کی ساری زمینوں کو خود انسان کی آزمائش کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ اب یہاں باعتبار لغت مُسْتَقَرٌّ اور مُسْتَوْدَعٌ دونوں کے معنے ''عارضی جائے قرار'' ہوتے ہیں۔ البتہ امام رازیؒ کی تحقیق کے مطابق، جسے بہت سارے دیگر مفسرین نے بھی اپنایا ہے، آخر الذکر کے برخلاف اول الذکر لفظ میں زیادہ ثبات و پائیداری پائی جاتی ہے۔ یعنی مُسْتَقَرٌّ زیادہ رہنے اور مُسْتَوْدَعٌ نسبتاً کم رہنے کی جگہوں کو کہا جاتا ہے۔ نیز جیسا کہ ہمارے دوسرے مضمون میں آیات شوریٰ: ۲۹ اور نحل: ۴۹ کے تحت گزر چکا دَآبَّةٌ کا اطلاق سارے ہی جانداروں پر ہوتا ہے، جن میں خود انسان بھی شامل ہے۔ جب کہ حسب ذیل آیت کریمہ میں براہ راست نوع انسانی ہی سے خطاب کرتے ہوئے خود اس کے لئے بھی ایک مُسْتَقَرٌّ اور ایک مُسْتَوْدَعٌ ہونے کی خبر دی جا رہی ہے:

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ، قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ (انعام:۹۸)	وہی ہے جس نے تمہیں ایک شخص سے پیدا کیا، سو تمہارے لئے ایک جگہ زیادہ رہنے کی اور ایک جگہ کم رہنے کی ہے۔ بے شک ہم نے نشانیوں کو سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔

لہذا پشت آدمؑ سے ظہور میں آنے کے بعد ہر انسان کی ایک زیادہ رہنے اور ایک کم

رہنے کی جگہوں سے کیا مراد ہوسکتا ہے اس کی توجیہ متصل اگلی ہی آیت میں وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِیْ سِتَّةِ أَیَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ أَیُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق چھ دنوں میں اس وقت کی جب کہ اس کا عرش پانی پر تھا تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ عمل کے لحاظ سے تم میں سب سے اچھا کون ہے) کے ذریعے کی جارہی ہے کہ ساتوں آسمانوں میں موجود ساری زمینوں کو خود اس کی آزمائش کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سے بالکل عیاں ہے کہ انسان کے ان زیادہ اور کم رہنے کی جگہوں کا تعلق اس زمین سے نہیں بلکہ ساری آسمانی زمینوں سے ہے، جہاں وہ اس کے لئے بنائے گئے بالترتیب مِنْهَاجٌ اور شِرْعَةٌ پر ہر طرح سے منطبق بھی ہورہی ہیں۔ یعنی انسان کے زیادہ رہنے کی جگہ سے مراد وہ زمینیں ہوتی ہیں جو ساتوں آسمانوں میں جاری کشادہ راستوں کے اندر واقع ہیں، جب کہ اس کے کم رہنے کی جگہ سے مراد صرف دنیوی آسمان میں پھیلے ہوئے نسبتاً چھوٹے راستوں سے منسلک زمینیں ہیں۔ اسی لئے اس اعلان کے فوراً بعد وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْآ إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ کے ذریعے منکرین پر حجت قائم کی جارہی ہے کہ جب انہیں اس قدر زندگیوں سے نوازا جارہا ہے تو وہ موت کے بعد بعثت کا انکار کیسے کرسکتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت خصوصیت کے ساتھ اس امر پر غور کیا جاسکتا ہے کہ تاریخ تفسیر کی یہ اور اس طرح کی دیگر مشکل ترین اور نہایت مختلف فیہ تعبیرات موجودہ فلسفۂ تعدد تخلیق انسانی کے ذریعے کس قدر آسانی اور خوبصورتی کے ساتھ حل ہوتی جاتی ہیں۔ اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ کتاب الٰہی کی بیشتر متشابہات کی نوعیت محض اضافی زمانی کی ہوتی ہے، جو مناسب و موزوں اوقات میں نوع انسانی پر اپنا عظیم علمی اعجاز نہایت طاقتور طریقے سے ظاہر کرتے ہوئے عین محکمات میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔

اب ہم مزید فلسفہء تعدد تخلیق انسانی کے ایک اور چونکا دینے والے گوشے کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے۔ شمارہ ۳ کے تحت ماضی ہی میں ہماری ایک اور پیدائش زمین سے بھی کئے جانے کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ لہٰذا اب اس آیت پاک کا از سر نو جائزہ لے کر ہم اس مسئلے کے خدوخال کو واضح کرنا چاہیں گے:

هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنشَأَكُم مِّنَ	وہ تمہیں خوب جانتا ہے جب کہ اس نے تمہیں زمین
الْأَرْضِ وَإِذْ أَنتُمْ أَجِنَّةٌ فِي	سے پیدا کیا تھا، اور اس وقت بھی جب تم اپنی
بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ (نجم: ۳۲)	ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی حالت میں تھے۔

اس آیت پاک میں خطاب عمومی طور پر پوری نوع انسانی سے ہے۔ یہاں الفاظ قرآنی کے ظاہر سے حقیقی طور پر انسان کی دو حالتوں کا پتہ چل رہا ہے: پہلی وہ جب اسے زمین سے پیدا کیا گیا تھا، اور دوسری وہ جب وہ ماں کے پیٹ میں جنین کی حالت میں تھا۔ مگر اس کی اس پہلی پیدائش سے کیا مراد ہوسکتا ہے متقدم مفسرین کی جانب سے الفاظ قرآنی کے حقیقی مفہوم سے ہٹ کر اس کی ایک مجازی تاویل یہ منقول ہوئی ہے کہ چونکہ حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا، اور چونکہ سارے انسان ان ہی کی اولاد ہیں لہذا ان سب کی پیدائش کو ان کے جد امجد اور مورث اعلی کی پیدائش پر محمول کر دیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر یہاں بیان انسان کی تخلیق شخصی کا نہیں بلکہ اس کی خلقت نوعی کا ہو رہا ہے۔ مگر چونکہ یہ توجیہ خود ان ہی مفسرین کے نزدیک کسی مضبوط و مستحکم علمی یا عقلی بنیاد پر مبنی نہیں تھی لہذا ان سے اس کی ایک اور تاویل یہ بھی منقول ہوئی ہے کہ انسان کی پیدائش چونکہ نطفے سے ہوئی ہے اور نطفہ خود ان غذاؤں سے بنتا ہے جو زمین سے اگتی ہیں اس لئے اس کے نطفے سے پیدا کئے جانے کو بالواسطہ طور پر اسے خود زمین ہی سے پیدا کیا جانا قرار دے دیا گیا ہے۔

جب کہ قرآن حکیم میں حضرت آدمؑ کی تخلیق خصوصی کا تذکرہ جہاں کہیں بھی آیا ہے وہاں آپؑ کی پیدائش زمین سے نہیں بلکہ طِيْنٌ (مٹی)، تُرَابٌ (مٹی) یا صَلْصَالٌ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنَ (لس دار گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی) سے کیا جانا مذکور ہوا ہے، جس کے لئے اعراف: ۱۲، بنی اسرائیل: ۶۱، صٓ: ۷۱-۷۲، آل عمران: ۵۹ اور حجر: ۲۶-۲۹ ملاحظہ ہوں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ خود زمین بھی مٹی ہی سے بنی ہے۔ نیز اس وقت حسب ذیل آیت کریمہ ملاحظہ ہو، جہاں ایک انفرادی شخص کی تخلیق بھی مٹی ہی سے کئے جانے کا بیان ہو رہا ہے، جس سے اس کی تخلیق نوعی کے بجائے تخلیق شخصی ہی کی جانب نہایت بلیغ اشارہ نکلتا ہے:

قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ	اسے اس کے ساتھی نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ
أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِن تُرَابٍ	کیا تو اس کا منکر ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا

تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ سَوّٰكَ رَجُلًا (کہف: ۳۷)	کیا ہے، پھر نطفے سے بھی، پھر آدمی کی شکل میں بھی درست کیا؟

یہاں اگر دوسری تاویل مراد ہوتی تو خود موجودہ شمارے کے تحت مذکور ان دونوں آیات میں بھی اور حسب ذیل آیت میں بھی انسان کی مٹی اور نطفے سے دو مختلف مدتوں میں دو الگ الگ پیدائشیں مذکور نہ ہوتیں، بلکہ کسی ایک ہی سے تخلیق کے ذکر پر اکتفا کر دیا جاتا:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ (فاطر: ۱۱)	اللہ تمہیں مٹی سے پیدا کر چکا ہے، پھر نطفے سے بھی۔

ملحوظ رہے کہ ثُمَّ (پھر) ترتیب کے ساتھ تراخی کا بھی فائدہ دیتا ہے۔ لہٰذا اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی تخلیق پہلے مٹی سے کرنے کے ایک مدت بعد ہی اسے نطفے سے پیدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ متقدمین میں خصوصیت کے ساتھ پانچویں صدی ہجری کے مشہور متکلم اور الفاظ قرآنی کے نامور محقق صاحب "المفردات فی غریب القرآن" امام راغب اصفہانیؒ کا مذہب بھی یہی تھا۔ اب حسب ذیل آیات کریمہ ہمارے اس نقطۂ نظر کو جلا بخشتے ہوئے اس فلسفے کو مزید آگے بڑھانے والی بھی ہیں:

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ۔ ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ۔ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا، ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ (مؤمنون: ۱۲-۱۴)	یقیناً ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا۔ پھر اسے ایک محفوظ مقام میں نطفہ بنا دیا۔ پھر نطفے کو خون کا لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے کو گوشت کی بوٹی بنائی، پھر بوٹی سے ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا دیا۔ سو اللہ بڑا بابرکت ہے جو سب سے بہتر پیدا کرنے والا ہے۔

یہ آیات پاک تعبیر میں اعجازی تبدیلی والی اور پچھلے شمارے کی مختلف النوع تینوں آیات کے اجمال کی بخوبی تفصیل بیان کرنے والی اور انسان کے مٹی اور نطفے کے ذریعے دو مختلف اوقات

میں دو الگ الگ پیدائشوں کو مزید موکد کرتے ہوئے ان دونوں پیدائشوں کے درمیان ربط وتعلق کو اجاگر کرنے والی اور تخلیق انسانی کا ایک مربوط خاکہ پیش کرنے والی بھی ہیں۔ چنانچہ یہاں پہلی آیت وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (یقیناً ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا) سے ظاہر ہے کہ انسان کی تخلیق پہلے مٹی سے کر کے اسے کسی آزاد وخود مختار اور متعین شکل وصورت میں ڈھالا گیا تھا، کیوں کہ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً (پھر ہم نے اسے نطفہ بنادیا) خبر دے رہا ہے کہ ایک مدت تک اسی شکل وصورت میں رہنے دینے کے بعد ہی اور خود اسی مٹی والے انسان کو نطفے میں تبدیل کیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ اس فقرے میں ضمیر واحد مذکر غائب کا مرجع اَلْإِنْسَانُ ہی ہے۔ یہاں تعبیر کا فرق بھی ملحوظ رہے کہ اگر سابقہ شمارے کی تینوں آیات میں انسان کی تخلیق مٹی کے علاوہ نطفے سے بھی کیا جانا مذکور ہوا تھا تو یہاں پہلے مٹی سے کسی شکل و صورت میں ڈھالے گئے انسان ہی کو آگے چل کر نطفے میں تبدیل کردئے جانے کی نہایت دوررس عواقب ونتائج کی حامل خبر دی جارہی ہے۔ یعنی انسان کی تخلیق نطفے سے نہیں بلکہ خود سابقہ مٹی والے انسان ہی کو نطفے میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ اسی لئے اس حقیقت میں مزید تاکید پیدا کرتے ہوئے آگے ثُمَّ أَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (پھر ہم نے اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنادیا) کے ذریعے بتایا جارہا ہے کہ ایک مدت بعد جب اسے نطفے کے ذریعے اس کے موجودہ رنگ روپ میں بھی ڈھالا گیا تو وہ مٹی سے اپنی سابقہ پیدائش سے ایک بالکل ہی الگ نوعیت کی مخلوق ثابت ہوا!

شیخ محمد الغزالی
(اسلامی مفکر، داعی، خطیب اور انشاء پرداز)

جناب ایس، کفیل احمد قاسمی

عرب دنیا کی جدید تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ اس پر دو چیزوں کا بہت گہرا اثر پڑا۔ پہلا اثر خارجی تھا اور دوسرا داخلی۔ خارجی اثر کے سلسلہ میں کہا جاسکتا ہے کہ مصر اور دیگر عرب ممالک پر مغرب کے سیاسی، سماجی، ادبی اور معاشی اثرات مرتب ہوئے، مصر پر نپولین کے حملہ کے بعد عرب ممالک ایک نئی تہذیب اور جدید علوم وفنون سے متعارف ہوئے اور عصری تغیر وتبدل اور زمانی ارتقاء نے ان کے فکر، علم اور فکر تہذیب کو بڑی حد تک متاثر بھی کیا۔

خارجی اثرات کی بہ نسبت داخلی اثرات اور ہمہ گیر تھے جو مختلف مذہبی تحریکوں جیسے وہابی تحریک، سنوسی تحریک، مہدوی تحریک اور الاخوان المسلمون کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ ان تحریکات کے نتیجے میں فکر وفہم میں بیداری آئی اور ایک مدت کے فکری جمود کا خاتمہ ہوا، آزادی خیال، تحریروں اور تقریروں میں اظہار کی آزادی کی باعث ہوئی، انیسویں صدی میں جب مختلف راہوں سے مغربی افکار کی آمد عربوں کے ہر گوشہ حیات پر اثر انداز ہو رہی تھیں اور اسلامی معاشرہ ذہنی کش مکش اور عملی احساس کمتری کا شکار ہو رہا تھا اس وقت اس احساس کو ختم کرنے میں دو طرح کے مسائل تھے۔ اولاً تو یہ کہ مغربی بالا دستی کا خاتمہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کے اثرات بد کو روکنے کی کوشش کی جائے۔ غور وفکر کے بعد مفکرین اور مصلحین نے مسلم نوجوانوں کو جدید علوم وفنون کے ساتھ اپنی تاریخ اور تہذیب سے واقف کرانے اور اسلام کو ایک جامع نظام حیات کے طور

پروفیسر شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

پر پیش کرنے اور اسے ایک سیاسی، معاشی اور سماجی نظام کی حیثیت سے نافذ کرنے کے نسخے ہی میں امت کی بہبودی مضمر سمجھی اور اس کے لیے عصر حاضر میں دین کی صالحیت و موزونیت اور اجتماعی تعلیمات کی اہمیت، باطل و فاسد عقائد و افکار کے رد و ابطال اور فہم دین کے لیے قرآن و سنت سے رجوع اور اعتصام بحبل اللہ کو اولیت دی، اس جد و جہد کے نتیجے میں اسلامی تعلیمات جدید غور و فکر کے لیے مرکز توجہ ہوئیں، اسلامی موضوعات کے تعلق علم و تحقیق میں پیش رفت ہوئی اور ایسے اصحاب فکر و دانش اور صاحبان دعوت و عزیمت سامنے آئے جن کی کاوشوں سے افکار باطلہ کا گرد و غبار صاف ہوا۔

یہ عمل جس مکتب فکر کی شکل میں نمایاں ہوا، اس کے سب سے بڑے نمائندہ جمال الدین افغانی (م ۱۸۹۸ء) تھے۔ ان کے شاگرد رشید شیخ محمد عبدہ (م ۱۹۰۵ء) کی ذہانت، اصابت رائے اور قائدانہ صلاحیت کی وجہ سے اس مکتب فکر کو اور تقویت ملی، ان کے قافلے میں قاسم امین (م ۱۹۰۸ء)، رشید رضا (م ۱۹۱۳ء)، کرد علی (م ۱۹۵۳ء)، سعد زغلول (م ۱۹۲۷ء)، لطفی السید (م ۱۹۶۳ء) اور احمد تیمور (م ۱۹۳۰ء) جیسے مشاہیر نظر آنے لگے، الاخوان المسلمون کی مشہور تحریک اس وقت مصر میں رونما ہوئی، جب علمی اور ادبی اعتبار سے مصر ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ قدیم و جدید رجحانات کے تصادم اور ناسازگار حالات کے باوجود علم و ادب کا کارواں آگے بڑھ رہا تھا، اخوانی مصر میں مغربی طرز جمہوریت کے ہم نوا نہیں تھے بلکہ ایک ایسی جمہوریت کے خواہش مند تھے جو اسلامی تقاضوں کے مطابق ہو۔ اخوان کے متعلق مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا خیال ہے کہ ''واقعہ یہ ہے کہ اگر اخوان کچھ عرصہ تک عملی سیاست میں حصہ نہ لیتے (یا اس عملی سیاست میں الجھانے لیے جاتے) اور اپنا اصلاحی و دعوتی کام پوری قوت سے جاری رکھتے تو ممالک عربیہ میں ایک اسلامی انقلاب برپا ہو جاتا اور ایک نئی زندگی پیدا ہو جاتی۔ مجھے مستند اور باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں شیخ حسن البناء کو خود اس کا شدید صدمہ اور قلق تھا کہ ان کو قبل از وقت سیاسی میدان میں اترنا پڑا اور ان کا دامن کانٹوں سے الجھ گیا۔ ان کو اس کی بڑی تمنا تھی کہ ان کو پھر خالص دعوتی و تربیتی کام کا موقعہ ملے اور وہ جماعت اور جمہور مسلمین میں وہ استعداد پیدا کر سکیں جس کے بعد وہ ہر طرح کی ذمہ داری پوری کر سکیں اور ہر امتحان و آزمائش سے گذر سکیں''۔(۱)

یہ وہ زمانہ تھا جس میں مسلم معاشرہ چند عبادات رسوم و روایات تک محدود رہ گیا تھا، سماجی و معاشی مسائل اور دیگر باطنی و ظاہری حالات میں اسلامی تعلیمات کا عملی اثر بس خال خال تھا۔ آپسی اختلافات سے نقطہ اتحاد کہیں غائب ہو چکا تھا، ایسے حالات میں ایک مفکر، خطیب، منفرد انشاء پرداز اور علوم قرآن پر عبور رکھنے والی شخصیت ابھر کر سامنے آئی، جس کا قلم اسلام کے دفاع کے لیے اور جس کی فکر امت مسلمہ کی اصلاح کے لیے وقف، اس صبر و ثبات اور عزم و استقلال کی خوبیوں کے ساتھ اس نے پوری زندگی میں آزادی فکر، آزادی نفس، آزادی تقریر و تحریر کی دعوت دی۔ یہ مثالی شخصیت شیخ محمد الغزالی کی تھی۔

وہ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۷ء میں بحیرہ نامی اس گاؤں میں پیدا ہوئے جسے شیخ محمد عبدہ، شیخ محمود شلتوت، شیخ الازہر، شیخ حسن البناء، شیخ سلیم البشری، شیخ ابراہیم حمروش، ڈاکٹر محمد البھی، شیخ محمد المیدانی اور شیخ عبدالعزیز عیسی جیسے لوگوں کی جائے پیدائش کا شرف حاصل ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے لیے اسکندریہ کے ایک دینی ادارے میں داخل کیے گئے جو الازہر کے ماتحت تھا۔ ان کے جوہر بچپن ہی سے نمایاں ہونے لگے، ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۳۷ء میں الازہر کے کلیہ اصول الدین میں داخل ہوئے اور ۱۹۴۱ء میں یہاں سے فراغت حاصل کی۔ ہر جگہ محمد الغزالی اپنے شوق، محنت اور حسن اخلاق کی وجہ سے اساتذہ اور طلبہ میں یکساں طور پر مقبول رہے، وہ جس مجلس میں ہوتے تھے اپنی گفتگو سے خداداد صلاحیتوں کا مظہر بن جاتے۔ ان سے ملنے والا پھر دوسری ملاقات کا متمنی ہو جاتا۔ ۱۹۴۳ء میں انہوں نے تدریس میں تخصص کیا جو الازہر کے کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے ماجستر کے مساوی تھا۔

اسکندریہ میں شیخ محمد الغزالی کی ملاقات ۱۹۳۵ء میں شیخ حسن البناء شہید سے ہوئی، الغزالی ان کے علم و فضل اور خطابت کے معترف اور اسلامی نظریات کو عام کرنے میں ان کی خدمات سے بے حد متاثر تھے۔ ایک جگہ ان کے متعلق لکھتے ہیں: أما اثری الاکبر فقد کان بالامام الشهيد حسن البناء وكان عالما بالدين كأفقه ما يكون علماء العقيدة والشريعة ، وكان خطيبا متدفقا ينساب الكلام منه اصولا لا فضولا وحقائق لا خيالات ......"۔(۲)

قاہرہ آنے کے بعد الغزالی کا تعلق حسن البناء سے اور بھی گہرا ہوگیا اور اخوان سے وابستہ ہوکر وہ حسن البناء کے معتمدین خاص میں سے ایک ہوگئے۔حسن البناء ان کی تحریروں کو دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے اکثر وبیش تر یہ کہا کرتے تھے" اکتب دائما و روح القدس يؤيدك والله معك "۔(۳)

حسن البناء نے اپنے بعد اخوان کی قیادت کے لیے جن حضرات کے ناموں کی نشان دہی کی تھی ان میں محمد الغزالی کا نام بھی تھا۔تاہم جب حسن الھضیبی (و ۱۹۷۳ء) اس تحریک کے قائد ہوئے تو الغزالی اخوان سے الگ ہوگئے مگر اس کی حمایت مدت العمر کرتے رہے،اسی کے ساتھ وہ ایک اسلامی پارٹی کے قیام کے خواہاں تھے۔جیسا کہ اسلامک ورلڈ جلد ۲،ص ۶۳ - ۶۴ سے اندازہوتا ہے:

"Al-Ghazali was dismissed from his position in the (constitutional body) of the Ikhwan in Dec 1953 ہیئۃ التاسیۃ reporte by after attempting, with two other permanent (with حسن الھضیبی members. to unseal the orgnization's leads approval, some Muslim Brother suspected). May feel that he still remains on Ikhwani in all but name and he certainly favours the formation of Islamic party in Egypt foray"

شیخ الغزالی اسکندریہ کے دو اشخاص ابراہیم الغرباوی اور عبدالعزیز بلال سے متاثر تھے ان سے کسب فیض بھی کیا تھا،ایک جگہ لکھتے ہیں:" وكانا يشتغلان بالتربية النفسية ولهما درجة عالية فى العبادة والتقوى ، وكانا يمزجان الدرس برقابة الله وطلب الآخرة وعدم الفتنة بنيل الاجازات العلمية لان للالقاب العلمية طينا ربما ذهب معه الاخلاص المنشود فى الدين "۔(۴)

وہ شیخ عبدالعظیم الزرقانی استاد کلیۃ اصول الدین الازہر اور شیخ محمود شلتوت استاذ تفسیر الازہر وشیخ الازہر سے بھی متاثر تھے،شیخ عبدالعظیم الزرقانی کی شہرۂ آفاق تصنیف" مناهل العرفان

فی علوم القرآن ''الغزالی کی پسندیدہ کتابوں میں سے تھی اور شیخ محمود شلتوت کے متعلق ان کی رائے یہ تھی ''کہ تفسیر کے میدان میں شیخ کو درک حاصل ہے اور فقہ وعلوم اسلامیہ پر ان کی گہری نظر اور شخصیت مرجع خلائق ہے۔(۵)

شیخ الغزالی کی تمام تر کوششوں کا مقصد اسلام کے خلاف ہونے والی ریشہ دوانیوں اور چیلنجز کے مقابلہ کے لیے عام مسلمانوں کو بیدار کرنا تھا تاکہ دنیا کے سامنے اسلام کی اصلی تصویر سامنے آئے اور غلط فہمیوں اور بے جا اعتراضات کا دروازہ بند ہو اور ایسی جماعت تیار ہو جو صحیح معنوں میں اسلام کی نمائندگی کر سکے، اس کے لیے انہوں نے خود کو وقف کر دیا، وہ پوری زندگی اسلام کا دفاع کرنے میں لگے رہے اور جب بھی کسی نے اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کی کوشش کی تو انہوں نے دلیری کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا، اخوان جس سے وہ زندگی بھر وابستہ رہے اس کے کسی مفاد کو انہوں نے اسلامی مفاد پر ترجیح دینا گوارا نہیں کیا، وہ لکھتے ہیں ''اذا تعارضت مصلحة الاسلام مع الاخوان المسلمون فلیذهب الاخوان المسلمین الی الجحیم ''اسلام کی شکل کو بگاڑ کر پیش کرنے والے داخلی وخارجی دونوں قسم کے دشمنوں کا مقابلہ انہوں نے سینہ سپر ہو کر کیا۔(۶)

شیخ الغزالی جس مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے وہ مسلمانوں کی زندگی کو نئے ڈھنگ سے سنوارنے کا خواہاں تھا وہ بلاشبہ اس کے صحیح نمائندہ تھے، وہ اسلامی تاریخ کے تمام فکری رجحانات اور فقہی مسلکوں سے استفادہ کے قائل تھے اور جدید نفسیات، سماجیات، سیاسیات، اقتصادیات اور علم الاقوام کو کتاب وسنت اور فقہ اسلامی سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ظاہر ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب قدیم وجدید اور نقلی وعقلی علوم پر مہارت ہو۔

شیخ الغزالی کے خیال میں ایسے داعی اور مبلغین اسلام کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے جو غور وفکر اور مطالعہ سے شغف نہ رکھتے ہوں ان کے خیال میں ایسے لوگ حال سے بے خبر اور اسلام کو ایک ایسا روایتی مذہب سمجھتے ہیں جس کا رشتہ صرف ماضی سے ہے حاضر اور مستقبل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ایسے داعیوں کو شیخ اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ وہ مسائل جو اسلام کو درپیش ہیں ان میں کافی تبدیلی آئی ہے۔وہ نئے عنوانات اور تبدیل شدہ حقائق کے ساتھ ہمارے سامنے آرہے ہیں۔اس

زمانہ میں مخالفین اسلام کی جد و جہد تیز ہوگئی ہے اور وہ اپنے اثرات کے دائرہ کو وسیع تر کرتے جارہے ہیں اور داعیوں کے راستہ میں مشکلات کھڑے کرتے جارہے ہیں لہذا داعیوں اور مبلغوں کو چاہیے کہ وہ کتاب وسنت، فقہ اسلامی اور تہذیب اسلامی سے واقفیت کے ساتھ ساتھ موجودہ اقوام عالم کے علمی و تحقیقی مزاج اور تہذیب وتمدن کا صحیح اندازہ بھی کریں۔ ان کے دل باہمی کدورت، بغض وحسد اور انانیت سے پاک ہوں، خندہ پیشانی، وسعت قلبی، باہمی اتحاد وتعاون کے جذبہ سے سرشار ہوکر ہی دشمنان اسلام کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

الغزالی کی تقریروں اور تحریروں کا خلاصہ یہ ہے:

۱- اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے، مسلمانوں کے پاس کتاب الٰہی اور سنت نبوی بغیر تحریف وتبدل کے موجود ہے اور مسلمانوں میں جو باصلاحیت افراد ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو ضلالت وگمرہی سے نکال کر صراط مستقیم کی طرف بلائیں جیسا کہ رسول اللہؐ کا طریق کار تھا۔ اگر اس فریضہ سے انہوں نے بے توجہی برتی تو عذاب الٰہی سے دوچار ہوں گے۔

۲- قرآن وسنت، اصول تشریع اور تاریخ امم سے واقف حضرات ہی دعوت وتبلیغ کے فریضہ کو بہ حسن وخوبی انجام دے سکتے ہیں اور ایسے متخصصین خال خال ہی ہیں۔ (۷)

۳- دشمنان اسلام نے اپنی عسکری اور سیاسی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے مسلمانوں کے ثقافتی اور معاشرتی نظام کو نشانہ بنانے کا عزم کر رکھا ہے اور فروعی مسائل میں الجھا کر رکھ دیا ہے۔

۴- شوریٰ اسلامی اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے، مشرق کے بہت سے اسلامی ممالک نے مغربی جمہوریت کی نقل کرنے کی کوشش کی مگر اس کا تجربہ تلخ ثابت ہوا۔ اگر اس جمہوریت کو جو فسق وفجور، ایمان وکفر اور ہر طرح کی آزادی کی حامی ہے، ایک اسلامی دستور کا پابند بنایا جاتا تو شاید یہ صورت حال نہ ہوتی۔

۵- شیخ الغزالی اسلام کو امن وسلامتی کا سرچشمہ تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر امت نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں سرد مہری سے کام کیا تو یہ اسلامی تعلیمات کے ساتھ خیانت ہوگی، اسی طرح محبت یا عداوت کا اصل معیار اصول دین کی رعایت اور اس کا پاس ولحاظ ہے نہ کہ ذاتی مصالح ومفادات۔

۶- شیخ الغزالی اسلامی حدود کی پابندی کے ساتھ ساتھ آزادی نسواں کے حامی تھے، ان کی رائے کے مطابق ایک طرف بعض متعصب دینداروں کے ذہن میں یہ بات جم گئی ہے کہ دینی اور دنیاوی تمام معاملات میں عورتوں کی مداخلت صحیح نہیں تو دوسری طرف اس کے بعض حامیوں نے آزادی کے نام پر عورت کو بے حیائی پر آمادہ کرنے کی حماقت کا ارتکاب کیا ہے، الغزالی کے خیال میں دونوں نے حد سے تجاوز کرنے کی غلطی کی ہے، دیندار طبقہ نے جہاں اپنی خواہشات اور خود ساختہ اصولوں کو اسلام کا نام دے کر تھوپنے کی کوشش کی ہے تو وہیں آزادی نسواں کے نام نہاد حامیوں نے اسلام پہ الزام لگادیا کہ وہ عورتوں کا دشمن ہے، ان پر زیادتی کرنے والا اور ان کی ترقی میں رکاوٹیں کھڑی کرنے والا ہے حالانکہ یہ الزام بے سروپا اور بے بنیاد ہے، اسلام دین رحمت ہے اور عورت کو بھی اس رحمت سے مستفید ہونے کا اسی طرح حق ہے جس طرح مرد کو، اسلام انہیں علم حاصل کرنے کی پوری آزادی دیتا ہے، علم سے ان کا ذاتی وقار بلند ہوگا اور زیور علم سے آراستہ ہونے کی وجہ سے پورے معاشرہ میں سدھار آئے گا۔

۷- شیخ الغزالی انتہائی وسیع النظر شخص تھے، ان کا کہنا تھا کہ ہمارا تعلق اس امت سے ہے جس نے دنیا کو تہذیب وتمدن کا سبق اس وقت دیا جب اہل یورپ جہالت ونادانی میں زندگی بسر کررہے تھے۔ مسلمان مشرقی یا مغربی ایجادات مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن یا انٹرنیٹ، موٹر، ریل، ہوائی جہاز وغیرہ سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں یا نہیں، اس بحث کو عبث سمجھتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ سواری کی جائے یا نہیں، ساز وسامان کا استعمال خیر کے لیے ہے تو خیر ہے ورنہ شر، لہذا مسلمانوں کو اس میں الجھ کر اپنے اوقات کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

۸- رمضان کے متعلق شیخ کی رائے یہ ہے کہ روزہ صرف کھانے پینے سے رکنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد حصول تقوی ہے۔ ہم نے اس ماہ مقدس کے اصل مفہوم کو بھلا کر اس مہینہ کو بہتر سے بہتر کھانے اور صرف لذت کام ودہن کے حصول کا مہینہ بنا کر رکھ دیا ہے، یہ صورت اسلام کی اصل روح کے منافی ہے۔

۹- مختلف مذاہب کے لوگوں سے مذہب اسلام کے متعلق گفتگو ہونی چاہیے، ان کا خیال تھا گفت وشنید کا طریقہ جمہوری ہو اور مباحث سے قبل اس کے مقاصد واغراض کا تعین کرلیا

جائے، تا کہ بہتر نتائج سامنے آئیں۔

۱۰- جدید تہذیب وتمدن سے پیدا شدہ بعض مسائل کے سلسلہ میں وہ بددل تھے اوران کا خیال تھا کہ اس تہذیب کے علم برداروں کو نہ تو معبود حقیقی کی خوشی کی پرواہ ہے نہ اس کی ناراضگی کا خوف کیونکہ اس تہذیب میں ذاتی شخصی محرکات کارفرما ہیں یا اجتماعی اور تجارتی نقطہ نظر ہے جو مذہبی روح سے خالی ہے۔اس سلسلہ میں وہ بعض اعداد وشمار بھی پیش کرتے ہیں کہ یورپ اورامریکہ میں ناجائز بچوں کی بڑھتی تعداد کی مثال دیتے ہیں۔

۱۱- عربوں اور یہودیوں کے درمیان پرامن تعلقات کے سلسلہ میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ جب تک یہودیوں کی تحریف شدہ توریت کی یہ روایت کہ وہی حضرت ابراہیمؑ کے اصل وارث ہیں اورارض فلسطین پران کا پیدائشی حق ہے برقرار رہے گی اس وقت تک صلح ممکن نہیں ہے۔ان کے خیال کے مطابق پندرہ ملین یہودیوں میں سے ایک تہائی فلسطین میں آباد ہیں اور باقی دس ملین ادھر ادھر پھیلے ہوئے ہیں۔تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ دس ملین یہودی ساری دنیا کے حکمراں بن جائیں۔

۱۲- شیخ نوجوانوں کو اختلافات اور تعصب سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں کہ تعصب کے شکار مذہبی مقاصد کو اکثر غلط معنوں میں لے لیتے ہیں کبھی کبھی وہ کچھ کو کفر کے قریب پہنچا دیتے ہیں اور کبھی پورے گروہ کو ہی کافر قرار دے دیتے ہیں ۔ یہ موجودہ زمانہ کی تکنیکی ترقیوں اور ایجادات کا انکار کرتے ہیں ۔ یہ علم سے دوری اور شریعت کے اصلی سرچشموں سے فیض یاب نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے ۔اس لیے مسلم نوجوان حکمت و دانش سے آراستہ ہوں ، ان کا تفقہ سرسری مطالعہ اور شرعی نصوص کو سطحی انداز میں سمجھنے پر نہ ہو۔

۱۳- عربی زبان کی تعلیم وتدریس کے سلسلہ میں ان کی رائے یہ تھی کہ اس زبان کو عالمی زبان ہونا چاہیے، عام مسلمانوں کے لیے اس کی تعلیم وتدریس اور نشر واشاعت فرض کفایہ ہے، طہ حسین کے متعلق ان کا خیال تھا کہ ایک طویل عرصہ تک مجمع اللغۃ العربیہ کے صدر اور مصر کے وزیر تعلیم ہونے کے باوجود اس زبان کی نشر واشاعت کے لیے وہ کوئی قابل قدر کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔

۱۴- نجیب محفوظ کو نوبل انعام دیے جانے پر شیخ کی جانب سے جو ردعمل ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصنف کو اس کی مجموعی ادبی خدمات پر یہ انعام نہیں ملا ہے بلکہ اس ناول پر ملا ہے جس میں

عقیدۂ الٰہ پر اعتراض اور نبوت کا انکار ہے۔ ان کی نظر میں جمال عبدالناصر کی جانب سے اس کتاب پر عائد کردہ پابندی درست تھی۔(۸)

شیخ کے آراء وافکار کا ماحصل یہ ہے کہ عقل ونقل، اصول وفروع اور دین ودنیا میں توازن ہو، ان مصلحت پسندوں سے پرہیز کیا جائے جو نصوص شرعیہ کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور ایسوں کی تقلید سے باز رہا جائے جو محض عقل کا سہارا لے کر منقولات کا انکار کرتے ہیں، مغربیت اور اشتراکیت پر ان کی تنقید اس لیے ہے کہ وہ فطرت کے خلاف ہے، حق کو حق سمجھ کر وہ سامراج، صہیونیت، عیسائیت، سوشلزم، کمیونزم اور لادینیت کے خلاف مستقل جنگ کرتے رہے۔

شیخ الغزالی کا تصنیفی سفر ۱۹۴۷ء میں شروع ہوا اور اولین تصنیف ''الاسلام والاوضاع الاقتصادية'' منظر عام پر آئی اسی موضوع پر الاسلام والمناهج الاشتراكية ، الاسلام فى وجه الزحف الاحمر اور الاسلام المفترى عليه بين الشيوعيين کتابیں قابل ذکر ہیں، عقیدہ وکلام میں ''خلق المسلم ، عقيدة المسلم ، التعصب و التسامح ، جدد حياتك ، فى موكب الدعوة ، فقه السيرة ، ليس من الاسلام، من معالم الحق ، كيف تفهم الاسلام ، نظرات فى القران ، مع الله دراسات فى الدعوة والدعاة ، معركة المصحف ، الجانب العاطفى من الاسلام اور سر تاخر العرب والمسلمين وغیرہ کتابیں ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف ''من هنا نعلم '' میں اسلامی تہذیب وتمدن کے احیاء کی وکالت اور نام نہاد سیکولرزم اور مغرب نوازی کے رجحانات کی تردید کی گئی ہے۔ ''حقيقة القومية العربية'' مغربی قومیت کے تصور کے رد اور ''العقيدة والشريعة ضد مطاعن المستشرقين'' مشہور مستشرق گولڈزیہر کی تصنیف ''العقيدة والشريعة'' کے جواب میں ہے۔

قرآنیات میں ''كيف نفهم القرآن ، المصادر الخمسة للقرآن ، نحو تفسير موضوعى للقرآن اور نظرات فى القرآن'' مفید کتابیں ہیں۔

''السنة النبوية بين اهل الفقه واهل الحديث'' میں اہل فقہ کو اہل حدیث پر ترجیح دی گئی ہے، ان کی رائے کے مطابق محدثین صرف احادیث نقل کرتے ہیں جبکہ فقہاء ان سے

مسائل کا استنباط کرتے ہیں، اس تصنیف پر اعتراضات بھی کیے گئے۔

ان کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے وہ اپنی عبارتوں میں جا بجا قرآنی تعبیرات کو خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ حدیث نبوی کا اثر بھی شیخ کی عبارتوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔

اشعار عرب کا خوبصورت استعمال شیخ کی عبارتوں میں جا بجا ملتا ہے، اوس بن حجر، محمد بن عیسی بن طلحہ، زہیر بن ابی سلمی، احمد شوقی اور دیگر شعراء کے اشعار ان کی تحریروں اور تقریروں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ عبارتوں میں صفت تجنیس، صفت طباق اور صفت مقابلہ کا بھی اہتمام ملتا ہے لیکن کہیں کہیں غیر شعوری طور پر عامیانہ تعبیرات آجاتی ہیں۔

شیخ الغزالی جس مسجد میں خطبہ دیتے وہ مرجع خلائق بن جاتی: مسجد عمر مکرم (میدان التحریر، القاہرہ)، مسجد عمرو بن العاص (مصر میں اسلامی تاریخ کی پہلی مسجد)، مسجد نور عباسیہ اور جامع مسجد الازہر وغیرہ میں ان کے خطبے کے لیے خلقت امنڈ پڑتی اور۔ نمازیوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہو جاتی، عیدین میں یہ تعداد ڈھائی لاکھ تک پہنچ جاتی تھی، (۹) شیخ کے خطبات کو نو سال قبل پانچ جلدوں میں قطب عبدالحمید نے مدون کر کے ڈاکٹر محمد عاشور کی نظر ثانی کے بعد دار الاعتصام القاہرہ سے ۱۹۸۷ء میں شائع کر دیا، علوم اسلامیہ میں یہ خطبے اہم مراجع بلکہ قابل اعتماد تاریخی دستاویز ہیں جن سے اس دور کی تاریخ مرتب کرنے والوں کو اس زمانے کے مسائل کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۶ تک لگ بھگ چالیس سال کے عرصہ میں شیخ الغزالی کی تصانیف کی تعداد ساٹھ تک ہو گئی، ان کی تمام کتابوں کو دار الشروق اور دار الصحوۃ للنشر والتوزیع نے شائع کیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ سیکڑوں مقالے ہیں، انٹرویو، ریڈیو اور ٹی وی نشریات اور جمعہ وعیدین کے خطبات کے ذریعہ انہوں نے اسلامی تحریک کو فروغ دیا۔ ان کی پوری زندگی اسلام کی خدمت سے عبارت تھی۔ معاصرین نے فراخ دلی سے ان کی خدمات کا اعتراف کیا اور ''امام المجددین، داعة فذّ، قدوة صالحة، فكر مستنير، صابر، المجاهد، حجة الاسلام، مجدد العصر، النجم الساطع، جامع العقل والنقل'' اور ''مدرسة عقلانية'' جیسے القاب کے ساتھ یاد کیا ہے۔ خدمات کے اعتراف میں ان کو ۱- فیصل ایوارڈ، ۲- وسام الجمهورية (مصر)،

۳-جائزہ الدولۃ التقدیریۃ (مصر)، ۴-نشان امتیاز (پاکستان)، ۵-جائزہ الدعوۃ الاسلامیہ (الجزائر) سے نوازا گیا، ۶-ایسیسکو کی جانب سے برونائی کے سلطان حسن ایوارڈ ۱۹۹۶ء کے لیے بھی نامزد کیا گیا لیکن تقریب سے پہلے ہی ۱۹/مارچ ۱۹۹۶ء کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، شیخ کو کسی انعام کی خواہش تھی اور نہ ہی کسی منصب کی تمنا۔ تعریف و توصیف سے بے نیاز ہوکر پورے اخلاص کے ساتھ وہ اپنی زبان و قلم سے اسلام کے دفاع کے لیے وقف تھے۔ اس راہ میں وہ ہر صبر آزما آزمائش سے کامیاب ہوکر نکلتے رہے اور ہر مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ان کی کچھ تصانیف میں خالص علمی اسلوب کی کمی نظر آئے، وہ خود کہتے تھے کہ ان کتابوں کو میں علمی آسودگی کی خاطر نہیں بلکہ معاشرہ میں موجود غلطیوں کی اصلاح کے لیے لکھا ہے، اسی طرح ان کی تحریروں میں کہیں کہیں تیزی و تندی کا احساس ہوتا ہے، درحقیقت یہ جذبہ ان کے اندر اس وقت بیدار ہوتا جب وہ حق کے خلاف کچھ دیکھتے تھے۔ باطل کے رد میں ان کی ایمانی حرارت کا اثر ان کے قلم اور زبان سے ظاہر ہوکر رہتا ، شیخ کے بعض افکار اور آراء سے اختلاف ممکن ہے لیکن ان کے خلوص اور ان کی صداقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

حوالے

(۱) پیش لفظ و تعارف ''تحریک اخوان المسلمین''، تالیف محمد شوقی زکی مصری، ترجمہ سید رضوان علی ندوی، ص ۱۱-۱۲، مکتبہ الحسنات رام پور۔ (۲) الشیخ محمد الغزالی بقلمہ، راجع خطب الشیخ محمد الغزالی، ۱/ ۳ دار الاعتصام، القاہرہ۔ (۳) الشیخ محمد الغزالی، د۔ عبدالحلیم عویس وآخرون، دار الصحوۃ للنشر والتوزیع، القاہرہ ۱۹۹۳ء۔ (۴) تفصیل کے لیے دیکھئے خطب الشیخ محمد الغزالی، ۱: ۱۴ دار الاعتصام، القاہرہ۔ (۵) مصدر سابق۔ (۶) الشیخ محمد الغزالی، د۔ عبدالحلیم عویس وآخرون، ص ۱۸۔ (۷) تفصیل کے لیے دیکھئے ''مقدمہ خطب الغزالی الجزء الاول اعداد قطب عبدالحمید قطب، ص ۱۵۔ (۸) مزید تفصیل کے لیے دیکھے ''جریدۃ العالم الاسلامی: ادارۃ الصحافۃ والنشر ، رابطۃ العالم الاسلامی، خصوصی ضمیمہ ۱۸/اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۷-۱۲، الشیخ محمد الغزالی بین۔ (۹) تفصیل کے لیے دیکھیے : ڈاکٹر عبدالحلیم عویس کا مقالہ بعنوان ''مراحل عظیمۃ فی حیاۃ مجاہد عظیم۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی
بحیثیت تبصرہ نگار

مولوی کلیم صفات اصلاحی

اردو میں تبصرہ نگاری کی روایت کے متعلق محققین نے لکھا ہے کہ تنقید کی طرح اردو میں اس کا آغاز بھی غدر کے بعد ہی ہوا، سب سے پہلے حالی نے اس جانب توجہ کی اور اخبارات و رسائل میں متعدد تبصرے لکھے (۱)، علامہ شبلی کی سیرۃ النعمان پر تبصرہ کے دوران مولانا حالی نے اپنا یہ نقطۂ نظر یہ پیش کیا:

''میرے نزدیک ریویو نگاری کا منصب صرف اس بات کا دیکھنا ہے کہ مصنف نے وہ فرائض جن کو زمانے کا مذاق ہر نئی تصنیف میں ڈھونڈتا ہے جس طرح پیاسا پانی کو۔ کس حد اور کس درجہ تک ادا کیے ہیں، پس جب ہم کسی کتاب پر لکھ رہے ہوں تو ہم کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ مصنف کی رائے جزئیات مسائل میں فی نفسہٖ کیسی ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کتاب کا عنوان کیا ہے، ترتیب کیسی ہے؟ طریق استدلال کیسا ہے، مذاق وقت کے مطابق ہے کہ نہیں''۔ (۲)

علامہ شبلی کا نقطۂ نظر: حالی کے بعد مولانا شبلی کے تبصروں کے مطالعہ سے جو انہوں نے الندوہ لکھنؤ میں عربی و فارسی کی اہم کتابوں مناقب عمر بن عبدالعزیز، کتاب الملل والنحل، المرأۃ المسلمہ، تفسیر کبیر، تاریخ ابن خلدون، بلاغات النساء، تاریخ التمدن الاسلام، العرب قبل الاسلام، نہایت الارب، تجارب الامم، شعر العرب، طبقات ابن سعد، تلفیق الاخبار اور اخبار الحکماء وغیرہ پر کیے تھے وہ گو اعلیٰ تنقید کے شاہکار نمونے ہیں تاہم علمی تبصرہ نگاری کے اسلوب و انداز کا پتہ دیتے

رفیق دارالمصنفین، اعظم گڈھ۔

ہیں، مولانا شبلی نے حالی کے برخلاف تبصرہ شدہ کتابوں میں زمانہ کا مذاق بھی ڈھونڈا ہے، کتاب کی ترتیب اور طریق استدلال سے بحث بھی کی ہے اور جس موضوع پر کتاب لکھی گئی ہے، مصنف نے کس حد تک اس کا احاطہ کیا ہے اس کا جائزہ بھی لیا ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ مصنف کے تسامحات اور فروگذاشتوں کی نشان دہی بھی کی ہے، مختصر یہ کہ مولانا شبلی نے اپنے تبصروں کو تبصرہ نگاری کے جس اعلیٰ مقام پر پہنچایا اس سے یہ تبصرے اعلیٰ معیاری تنقید اور معروضی نقطۂ نظر کے نمونہ بن گئے، مولانا شبلی دراصل تبصرہ کو معمولی چیز نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک تبصرہ نگاری کوئی آسان کام نہیں، ریویو کے لیے اصل فن کا احاطہ ضروری ہے، اس کے لیے وسعت نظر اور گہری فکر کی ضرورت ہوتی ہے، طرز تعبیر متین ہونا چاہیے، الفاظ بھی عامیانہ اور مبتذل نہ ہوں، درج ذیل خطوط سے ان کے اسی نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ مہدی افادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''ریویو کا جو تذکرہ آپ کے خط میں ہے وہ شاید مناسب نہ تھا، گو آپ کا منشا نہ ہو لیکن اس سے متبادر ہوتا ہے کہ ریویو گویا کتاب کا ایک قسم کا معاوضہ ہے حالانکہ مصنف کی یہ بڑی پست فطرتی ہے کہ وہ لوگوں سے ریویو لکھانے کا شائق ہو، اگر کوئی شخص کسی معقول کتاب پر ریویو لکھنے کی قابلیت رکھتا ہے تو ہر حالت میں اس کو لکھنا چاہیے لیکن ریویو کوئی آسان چیز نہیں، ہمارے ریویو نگاروں کے لیے یہی بہت ہے کہ ان کی یہ قابلیت تسلیم کی جاوے نہ کہ اس سے کسی مصنف پر احسان رکھا جاوے، ملک میں شاید ایسے مضمون نگار دو تین سے زیادہ نہیں ہیں جن کے ریویو سے کسی مصنف کو خوشی ہو سکے''۔(۳)

مولانا شبلی، مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی کے تبصرے کو اہمیت کی نظر سے دیکھتے تھے، الفاروق پر تبصرہ کرتے وقت مولانا کی رائے پڑھ کر جو رائے دی اس سے بھی فن تبصرہ نگاری کے متعلق مولانا شبلی کے نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، فرماتے ہیں:

> ''جیسے آج معارف آیا، ریویو پڑھا اور بار بار پڑھا، خدا کی قسم دیر تک ایک کیفیت طاری رہی، اگر خودستائی کا پہلو نہ نکلتا تو میں اس کو الفاروق کے ساتھ شامل کر کے شائع کرتا، زورِ قلم، ندرت استعارات، واقعہ طرازی کس کس

چیز کی داد دوں، ہاں ایک بات سنئے، یہ زور قلم، مضمونوں اور رسالوں پر ختم نہیں ہونا چاہیے، وسعت خیال اب مستقل تصنیف کا میدان چاہتی ہے، متوجہ ہوئیے اور کوئی مفید سلسلہ چھیڑ دیجیے''۔(۴)

مولانا ہی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

ریویو کے لیے اصل فن پر احاطہ کرنا پڑتا ہے، گولکھا کم جاتا ہے مگر وہ بہت وسعت نظر اور خوض وفکر کا نتیجہ ہوتا ہے''۔(۵)

مولانا عبدالسلام ندوی کے تبصرہ رسالہ ادیب پر تنبیہ کرتے ہوئے لکھا:

''رسالہ ادیب کی نسبت تم نے جو ریمارک لکھا ہے وہ اڈیٹوریل میں لکھا ہے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ میرا لکھا ہوا ہے، مجھ کو اس سے نہایت افسوس ہوا، میرا وہ طرز عبارت نہیں ہے اور جو مصرعہ تم نے نقل کیا ہے اس کو تو میں اپنے حق میں ازالۂ عرفی سمجھتا ہوں، آئندہ احتیاط رکھو کہ ایسے مبتذل اور عامیانہ فقرے درج نہ ہوں''۔(۶)

تبصرہ نگاری کے فروغ میں مولوی عبدالحق، پروفیسر محمود شیرانی، پنڈت کیفی، مولانا سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعظیم، پروفیسر احتشام حسین، خلیل الرحمان اعظمی اور ان کے بعد آل احمد سرور، ماہر القادری، عامر عثمانی اور شمس الرحمان فاروقی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، جنھوں نے تبصرہ نگاری میں تنقید کی تفصیل اور گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

معارف کا انداز تبصرہ نگاری: علامہ شبلی کے نزدیک تبصرہ نگاری آسان نہیں، یہی وجہ ہے کہ جب رسالہ معارف کا اجراء ہوا تو یہ اہم اور ضروری کالم پہلے خود سید صاحب نے سنبھالا، اس کے بعد دوسرے رفقائے دارالمصنّفین کا تیشۂ قلم جب اس میدان کو طے کرنے کے لیے تیار ہوگیا تو یہ علمی خدمت ان کے سپرد کی گئی، سید صاحب نے تبصروں کا وہی متوازن اور علمی انداز اپنایا جو ان کے استاذ علامہ شبلی نعمانی کا تھا، تبصرہ کے خاص کالم ''مطبوعات جدیدہ'' کے متعلق ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی لکھتے ہیں:

''البتہ اس کے لیے باب التقریظ والانتقاد کو خاص کردیا اور عام تبصرے

مطبوعات جدیدہ کے تحت کیے جاتے تھے جس میں سید صاحب نے اپنے زمانے
کے مذاق کے مطابق مختصر تبصرے کیے اور وہی انداز اردو کے نامور مبصرین کا تھا،
مطبوعات جدیدہ کے تحت عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں شائع ہونے والی
نئی کتابوں پر مختصر مگر جامع تبصرے کیے جاتے ہیں، معارف کے تبصرے اپنے
توازن اور علمی انداز کے لیے ممتاز ہیں، یہ مستقل عنوان معارف کے اجراء سے
برابر جاری ہے، ابتداء میں خود سید صاحب کتابوں پر تبصرے لکھتے تھے، پھر
دوسرے رفقائے دارالمصنّفین نے اس فرض کو انجام دیا''۔(۷)

آگے باب التقریظ کے متعلق لکھتے ہیں:

''باب التقریظ والانتقاد کے تحت کسی اہم کتاب پر تفصیلی نقد و تبصرہ ہوتا
ہے، ان تبصروں میں بے لاگ رائے کا اظہار کیا جاتا ہے، تنقیص و تعریض سے دور
رہ کر خالص سنجیدہ اسلوب اور علمی انداز میں زیر تبصرہ کتاب کے محاسن و فروگذاشتوں
کی نشان دہی کی جاتی ہے''۔(۸)

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی بے لاگ تبصرہ نگار رسالوں میں معارف کا نام شامل کیا
ہے۔ لکھتے ہیں:

''اردو میں بے لاگ تبصروں کی روایت نئی نہیں ہے، جو تبصرے ذاتی
بغض و عناد اور ذاتی تعلقات کو سامنے رکھ کر لکھے جاتے ہیں ان کی طرف عام طور
پر توجہ نہیں کی جاتی، اب اردو تبصرہ نگاری کا عام رجحان بے لاگ تبصرہ نگاری پر
ہے، تبصرے یوں تو تقریباً اردو میں مطبوعہ نصف سے زیادہ رسالوں میں شائع
ہوتے ہیں، تاہم معارف، آج کل، نیا دور وغیرہ جیسے معیاری رسائل کے نام ادبی
دنیا میں عزت سے لیے جاتے ہیں اور ان رسالوں میں جو تبصرے شائع ہوتے ہیں
وہ معقولیت، سنجیدگی، علمی متانت اور تحقیقی گہرائی لیے ہوئے ہوتے ہیں''۔(۹)

معارف جولائی ۱۹۱۶ء کے پہلے شمارے میں مطبوعات جدیدہ کے تحت مولانا عبدالماجد
دریابادی کی فلسفۂ اجتماع پر تبصرہ کرتے ہوئے سید صاحب نے لکھا کہ ''فلسفۂ اجتماع اردو زبان میں

۳۳۷ صفحوں کی ایک مستقل کتاب ہے، اس کتاب کا موضوع جماعات انسانی کے اجتماعی خصائص نفسانی کی فلسفیانہ تشریح ہے، آج کل جب مجامع عامہ کی کثرت، مجلس قومی کی شکست و ریخت نے ملک میں ہنگامۂ کارزار برپا کردیا ہے، اس کتاب کا مطالعہ ہر تعلیم یافتہ کے لیے ازبس ضروری ہے''۔(۱۰)

سید صاحب کا یہ تبصرہ فن تبصرہ نگاری کی میزان پر یقیناً پورا اترتا ہے، اس سے کتاب کا موضوع اور اس کی اہمیت و ضرورت کا علم ہوا اور فکری لحاظ سے اس کی افادیت بھی سامنے آئی۔ مبصر کے کتاب کے موضوع پر احاطہ کا بھی پتہ چلا۔ سید صاحب کے اسی نقش اول کی پیروی ان کے بعد کے مبصرین نے کی جس کی تفصیل کا موقع یہاں نہیں، معارف میں تبصرہ کا متوازن انداز یہی ہے۔

مشہور ناقد شمس الرحمان فاروقی نے اپنی کتاب میں تبصرہ کے اخلاقی پہلو پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر رسالہ کا اپنا مزاج ہوتا ہے (یا ہونا چاہیے) اور کتابوں پر تبصرے، رسالے کے مزاج اور کردار کے زیر اثر ہوتے ہیں مثال کے طور پر ''معارف'' میں افتخار جالب کے مجموعہ کلام پر تحسینی تبصرہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہونا چاہیے، ''برہان'' میں عشقیہ گیتوں کے مجموعے پر تبصرہ اگر ہوگا تو محض مختصراً تذکرہ ہوگا یا نکتہ چینی سے مملو ہوگا، ''شاعر'' میں کسی ایسی کتاب پر توصیفی تبصرہ نہیں ہوسکتا جو اردو زبان یا سیماب اکبرآبادی کی مخالفت کرتی ہو وغیرہ۔ ان تبصروں میں اس بات کا لحاظ نہ رکھا جائے گا (اور نہ رکھا جانا چاہیے) کہ یہ کتابیں اصلاً کتنی اچھی، کتنی مدلل، خوب صورت یا پرزور ہیں۔(۱۱)

محقق محترم کی رائے درست ہے کہ ہر رسالے کا اپنے مزاج کے مطابق تبصرہ ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے، معارف اور اس کے قارئین کا بھی ایک مزاج ہے، اہل نظر کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ معارف کا بنیادی مزاج علمی اور تحقیقی ہے اور اس نے ہمیشہ صالح فکر و ادب کی نمائندگی کی ہے، اسی کے ساتھ یہاں کسی علمی تصنیف کے پرکھنے کا جو معیار قائم ہے اس پر اگر کوئی تصنیف پوری اترتی ہے تو بلاشبہ اس پر تبصرہ کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے چنانچہ جوش ملیح آبادی، شفیق جون پوری اور فیض احمد فیض کے مجموعوں پر تبصرے معارف کے صفحات کی زینت بن چکے ہیں۔

تبصروں کی نوعیت اور مقاصد پر محققین کے آراء: تبصرہ نگاری کی روایت اور رسالہ معارف میں تبصرہ کے اسلوب و انداز کے بعد اردو میں تبصروں کے متعلق نقادان فن کے خیالات ہمارے پیش نظر رہے تاکہ مولانا اصلاحی کی مبصرانہ حیثیت واضح کرنے میں آسانی ہو۔

اردو میں بالعموم کتابوں پر تبصرہ کی نوعیت یہ ہے کہ زیر تبصرہ کتاب پر طائرانہ نظر ڈال کر اپنے ردعمل کا اظہار کردیا گیا اور اس میں جہاں تہاں عبارت آرائی کی چاشنی ملادی، تعریفی و توصیفی کلمات کے تانے بانے میں کتاب کے اصل موضوع اور مصنف نے کس حد تک موضوع کو نبھایا ہے اس کا پتہ نہیں لگ پاتا، بے لاگ تبصرہ نگاری یعنی بے خوفی اور معروضیت کے ساتھ ادبی، تحقیقی اور علمی کاوشوں کی تہوں کو کھول کر دیکھنے کے بعد اس پر رائے قائم کرنا اور بغیر کسی عصبیت اور جانب داری کے اس پر اظہار خیال کرنا بہت کم ہوتا ہے جس سے تبصرہ کی جگہ اشتہار بازی کا احساس ہوتا ہے، شمس الرحمان فاروقی اسی افسوس ناک صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہماری جدید ادبی صورت حال کا ایک عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ ہم ایک طرف تو اپنے اوپر اچھے سے اچھا تبصرہ دیکھنے کے مشتاق رہتے اور اس کے لیے سعی بھی کرتے ہیں اور دوسری طرف تبصرے کو اشتہار بازی کی سی گھٹیا چیز بھی کہنے پر مصر رہتے ہیں، یہ رویہ خود اعتمادی اور فنی ایمان داری کے فقدان کی دلیل ہے، اردو میں آزاد اور بے خوف تبصرہ نگاری کی روایت کے عدم استحکام کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں نے اکثر تبصروں سے اشتہار کا کام لیا ہے''۔(۱۲)

کلیم الدین احمد کے نزدیک تبصرہ نگاری پوری طرح تنقید نہیں ہے، اس کا مقصد تنقید سے قدرے مختلف ہے، ہاں یہ بات صحیح ہے کہ تبصرہ میں تنقید کی خصوصیات پائی جاتی ہیں مگر اس کی اپنی الگ ایک مستقل حیثیت بھی ہے(۱۳)، شمس الرحمان فاروقی صاحب نے تبصرہ اور تنقید کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تبصرہ ایک لمحاتی اور فوری چیز ہے، تنقید ایک مستقل اور پائیدار تحریر ہوتی ہے(۱۴)، فاروقی صاحب کی اس رائے سے اتفاق کر پانا مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی بھی تحریر یا رائے کی اہمیت وقت کے ساتھ محدود نہیں ہے، رائے میں اگر اصابت واستدلال

ہے تو مدتوں اس کا اثر باقی رہتا ہے، اسی طرح کسی کتاب پر اگر مضبوط دلائل سے کوئی رائے زنی کی گئی ہو تو اس کی اہمیت ہمیشہ رہے گی، مولانا حالی، مولوی عبدالحق، آل احمد سرور، ماہر القادری اور خود فاروقی صاحب کے تبصروں کا جو مجموعہ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا آج بھی اس کی اہمیت ہے۔

کلیم الدین احمد کا یہ موقف زیادہ صحیح ہے کہ تبصرہ عموماً کتابوں میں اس مقصد سے کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا کتاب اور اس کے موضوع سے واقف ہو جائے، اس سلسلہ میں تبصرہ نگار صرف کتاب کے موضوعات اور اس کی بعض اہم خصوصیات پیش کر دیتا ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ زیر تبصرہ کتاب پر کھل کر تنقید کرے گویا تبصرہ ایک طرح سے تعارف ہوتا ہے، اس کو کلیۃً تنقید نہیں کہا جاسکتا، برخلاف اس کے تنقید میں کسی کتاب یا تخلیق کی تمام خصوصیات اس طرح بتائی جاتی ہیں کہ اس میں تجزیہ کا پہلو پیدا ہوجاتا ہے وہ محاسن و معائب کو تجزیہ کے انداز میں پیش کرتی ہے جس کی وجہ سے اس میں تبصرہ نگاری سے کہیں زیادہ گہرائی اور وسعت کے عناصر پیدا ہوجاتے ہیں ...... لیکن موجودہ زمانہ میں بعض تبصرہ نگاروں نے تبصرہ کو تنقید کی منزل میں اس طرح داخل کر دیا ہے کہ تنقید اور تبصرہ میں کوئی فرق ہی باقی نہیں رہتا، ان کی تبصرہ نگاری اچھی خاصی تنقید نگاری ہوجاتی ہے، اچھے تبصرے وہ ہیں جن میں غیر جانب دارانہ رائے پیش کی جاتی ہے اور خارجی اثرات سے کسی طرح دامن بچایا جاتا ہے، تبصرہ کا مقصد کتاب کے جوہر کا پتہ لگانا اور اسے اجمال یا تفصیل کے ساتھ پیش کرنا ہے، یہ اس وقت ممکن ہے جب صحیح معیار موجود ہو، صحیح معیار کی عدم موجودگی میں تبصرہ لکھنا گویا ایسا ہے جیسے کوئی اندھا کسی تاریک کمرے میں کسی کالی بلی کا متلاشی ہو جو وہاں موجود نہیں ہے۔ (۱۵)

مذکورہ بالا بحث فن تبصرہ نگاری کی تاریخ اور اس کے اصول و مقاصد کی ایک ہلکی سی جھلک ہے، معلوم ہوا کہ تبصرہ نگاری دراصل تنقید کی ایک شاخ ہے تاہم اس کی اپنی ایک الگ مستقل حیثیت ہے۔ اس لیے کسی کتاب کے حسن و قبح کا اندازہ کرنے اور اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھنے کے لیے اصول تبصرہ نگاری سے واقفیت ضروری ہے، تبصرہ نگاری کوئی فوری یا لمحاتی چیز نہیں، تبصرہ نگاری اہم کام اور ایک بڑی ذمہ داری ہے، جس کتاب پر تبصرہ کرنا ہے مبصر کے لیے اس موضوع اور اس فن سے خاطر خواہ واقفیت بھی ضروری ہے، تبصرہ نگاری کا مقصد صرف کتاب کا تعارف نہیں

بلکہ علامہ شبلی کے نقطۂ نظر کے مطابق تبصرہ میں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ مصنف کا طرز استدلال کیسا ہے، کتاب کی ترتیب کیسی ہے، کتاب کا موضوع اور عنوان کیا ہے، اسی طرح تبصرہ نگار کو کسی خارجی اثر سے متاثر ہونے کے بجائے معروضی اور غیر جانب دارانہ نقطہ نظر اپنانا ہوگا، کیونکہ اچھے تبصرے وہی ہوتے ہیں جو غیر جانب دارانہ اور معروضی رائے کے حامل ہوتے ہیں اور اس قسم کے تبصرے کے لیے بلاشبہہ وسعت مطالعہ، تنقیدی بصیرت اور محققانہ ژرف نگاہی درکار ہے، معارف نے آغاز ہی سے اسی نقطہ نظر کو پیش نظر رکھا، یہی وجہ ہے کہ معارف کے تبصروں کو علمی و ادبی دنیا میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ سے مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم بلکہ معارف کے موجودہ تبصرہ نگار تک اسی روش پر قائم ہیں۔ گذر چکا ہے کہ معارف میں مختصر تبصرہ ''مطبوعات جدیدہ'' اور تفصیلی تبصرہ ''باب التقریظ والانتقاد'' کے تحت کیا جاتا ہے، یہاں دونوں قسم کے تبصرے ہمارے پیش نظر ہیں۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے قرآنیات، حدیث، فقہ، تاریخ و تذکرہ، کلام و عقائد اور شعر و ادب میں اردو، عربی اور فارسی کتابوں پر بے شمار تبصرے کیے جن کے مطالعہ سے مولانا اصلاحی کی تحقیقی نظر، وسعت مطالعہ، جامعیت، اصابت رائے، علمی توازن اور سب سے بڑھ کر دیانت دارانہ اور معروضی نقطہ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا اصلاحی نے جب یہ ذمہ داری سنبھالی تو انہوں نے اپنے پیش رووں کے تتبع میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، مولانا اصلاحی کے تبصروں کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے معارف کے موجودہ تبصرہ نگار مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی لکھتے ہیں:

> مولانا اصلاحی کو ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ شذرات کے بعد سب سے اہم اور لازمی کالم مطبوعات جدیدہ ان کے حوالہ کیا گیا، نئی مطبوعات پر تبصروں کا یہ کالم معارف کی جان ہے جس کے لیے ناقدانہ نظر تو درکار ہی ہے تبصرہ نگار کا مطالعہ بھی اس کے لیے وسیع اور ہمہ گیر چاہیے، زبان و بیان اور اصل مباحث سے آگاہی اور نقطہ نظر سے آگہی اس کے لیے شرط اول ہے... مولانا اصلاحی نے اس فرض کو جس حسن و خوبی سے ادا کیا ہے وہ کسی بڑے کارنامے سے کم نہیں،

بلا مبالغہ انہوں نے ہزاروں کتابوں پر جس محنت، توازن اور انصاف سے تبصروں کا عمل جاری رکھا، وہ شاید بے مثال کہا جائے گا''۔

مطبوعات جدیدہ کے تحت معارف میں مولانا اصلاحی کے قلم سے اولین تبصرے مارچ ۱۹۵۸ء میں پانچ کتابوں پر شائع ہوئے، دو قرآن، ایک سیرت، ایک عقیدہ اور دو شعر و ادب سے متعلق، پہلا تبصرہ رسالہ تفسیر سورۂ ذاریات مترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی پر ہے، اس میں مولانا نے رسالہ کا چند لفظوں میں تعارف کرانے کے بعد ترجمان القرآن مولانا فراہی کے تفسیری نقطۂ نظر کی وضاحت و انفرادیت پھر رسالہ میں زیر بحث موضوعات، ترجمہ کی خصوصیات اور آخر میں اس کی افادیت کا تذکرہ کیا ہے، مولانا کے الفاظ میں:

''اس میں سب سے پہلے مصنف نے سورہ کے مرکزی مضمون کی نشان دہی کی ہے اور سابق و لاحق سورتوں سے اس سورہ کا ربط و تعلق واضح فرمایا ہے پھر سورہ کا تجزیہ کر کے ترتیب کے ساتھ یکے بعد دیگرے ہر سلسلہ کی آیتوں کے الفاظ کی تحقیق، جملوں کی تاویل، سیاق و سباق سے تعلق، آیات کی باہمی مناسبت، سلسلۂ بیان کے اہم اور وقیع مباحث سے تعرض اور معضلات قرآنی کی دلنشین تشریح کی ہے اور بڑے حکیمانہ اور دلآویز نکات کا سراغ لگایا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جن مقامات سے مفسرین سرسری گزر جاتے ہیں وہاں مولانا کے فکر رسا نے دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں کے ایسے انبار لگا دیے ہیں کہ فہم قرآن کی بہت سی مشکلات خود بخود حل ہو جاتی ہیں، اس سورہ میں بھی بالخصوص نطق انسانی اور ہر چیز کے جوڑا جوڑا کیے جانے سے معاد پر جو لطیف استدلالات اور وما خلقت الجن والانس کی جیسی دل کش تاویل فرمائی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے اور اس کی خوبی پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتی ہے''۔(۱۶)

اہل علم جانتے ہیں کہ مصنف و مترجم رسالہ سے تبصرہ نگار کو خصوصی عقیدت و محبت تھی لیکن اس کے باوجود مولانا اصلاحی کے تبصرہ میں بے جا عقیدت کا کوئی لفظ بھی نظر نہیں آتا، مدلل مداحی کا الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا، معارف میں مولانا اصلاحی کا یہ پہلا تبصرہ معارف کے اصول

اور معیار سے کتنا ہم آہنگ تھا۔

''در یتیم''، مرتبہ احسان احمد صاحب بی اے کی کتاب پر تبصرہ کا یہ متوازن انداز ملاحظہ ہو:

''یہ کتاب ناول کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے اور صرف آپؐ کی یتیمی و بچپن کے چھ سالہ واقعات پر مشتمل ہے۔ پوری کتاب میں برکہ کا کردار، آمنہ کی اپنے شوہر سے غیر معمولی محبت، عربوں کے غلط اعتقادات اور محمدؐ کے آیندہ نبی ہونے کے آثار و علامات، بہت زیادہ نمایاں اور اجاگر ہیں اور یہ سب کچھ عقیدت و محبت کے والہانہ جذبہ کے ساتھ لکھا گیا ہے، اس لیے کتاب بڑی دلآویز اور دل کش ہوگئی ہے اور باوجودیکہ کتاب کا انداز ناول کا ہے لیکن مصنف نے داستان طرازی کے لیے بے بنیاد روایات سے بڑی حد تک اپنے قلم کو بچانے کی کوشش کی ہے''۔(۱۷)

لغات القرآن (جلد پنجم) مولفہ سید عبدالدائم الجلالی کے متعلق لکھا کہ ''یہ کتاب عام اور متداول کتابوں کی بہ نسبت زیادہ جامع اور مکمل معلوم ہوتی ہے، اس میں لغت اور تفسیر کی کتابوں کو پیش نظر رکھ کر قرآن مجید کے الفاظ کے علاوہ، قصوں اور بعض ضروری امور کی بھی تشریح کردی گئی ہے اور ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ مفرد الفاظ یا مصادر ہی کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے وہ تمام مشتقات و مرکبات جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں، پاروں اور رکوع کے حوالوں کے ساتھ درج کردیے گئے ہیں''۔(۱۸)

''اردو شاعری کی روایات اور دوسرے مضامین''، مرتبہ شارق میرٹھی، پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مرتب کے مختلف رسائل میں شائع مضامین کے اس مجموعہ میں چند کے علاوہ سبھی اچھے اور مصنف کی تلاش و محنت کا نتیجہ ہیں البتہ ہماری شاعری کا جغرافیائی پس منظر اور اردو شاعری کی روایات وغیرہ پر اور تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی، مصنف کا قلم نہایت سلامت رو اور محتاط ہے، چنانچہ ''نیا ادب'' اور ''ادب میں جدید میلانات'' پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں مشکل ہی سے بعض مقامات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔(۱۹)

عطاء اللہ سلفی کی ''دعوۃ الفطرۃ'' کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں اسلام کے بنیادی عقائد

پر متکلمانہ انداز سے بحث کی گئی اور ملاحدہ، مخالفین اسلام اور خود مسلمانوں کے گمراہ فرقوں کا جواب دیا گیا ہے، توحید کی بحث تقریباً نصف کتاب پر مشتمل ہے اور آخر میں خلافت علی منہاج النبوہ کا موجودہ جمہوریت اور اشتراکیت پر تفوق ثابت کیا گیا ہے، مجموعی اعتبار سے کتاب مفید ہے لیکن بعض فروگذاشتیں بھی ہیں (۲۰)، جن سے مولانا اصلاحی نے صرف نظر کر کے انہیں قارئین کے صواب دید پر چھوڑ دیا ہے اور تبصرہ میں ان کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھا۔

موجودہ صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ اور رکن انتظامیہ دارالمصنّفین مولانا سید محمد رابع ندوی کی عربی کتاب ''منثورات من ادب العرب'' پر لکھا کہ ''کتاب میں حدیث و سیر اور تاریخ و ادب کی قدیم و جدید کتابوں سے نظم و نثر کا ایک انتخاب عربی مدارس کے طلبہ کے لیے مرتب کیا گیا ہے، انتخاب میں زبان و ادب کی رعایت کے ساتھ اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ وہ دینی روح، اسلامی فکر، صالح مزاج اور اخلاق فاضلہ کا مرقع ہو، مجموعہ اتنا آسان اور عام فہم ہے کہ معمولی عربی جاننے والا بھی اسے اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، کتاب اس لائق ہے کہ مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہو''۔ (۲۱)

جناب حامد الانصاری غازی کی کتاب ''اسلام کا نظام حکومت'' کے متعلق لکھا کہ مصنف کا تکرار بیان جو بعض مقامات پر اگرچہ ضروری ہے مگر بہت گراں گزرتا ہے، ان کی بعض تشریحوں اور تعبیروں سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر کتاب بڑی فاضلانہ، محققانہ، مفید اور اپنے موضوع پر جامع ہے جس سے مصنف کی دقت نظر، وسعت مطالعہ اور غیر معمولی محنت و کاوش کا اندازہ ہوتا ہے، زبان و بیان اور طرز انشاء کے متعلق مصنف کا نام کافی ہے''۔ (۲۲)

لمعات القرآن، مرتبہ مولوی محمد حنیف کوٹواری پر اپنے تبصرہ میں لکھتے ہیں کہ ''یہ کتاب جس محنت اور کاوش سے مرتب کی گئی ہے اتنی کامیاب نہیں ہے، بہتر ہوتا کہ مصنف ہر باب کا افتتاح ایک جامع موضوع سے کرتے اور اسی سے متعلق اس باب میں آیات جمع کرتے، اس طرح کتاب کی ترتیب و تہذیب میں موزونیت پیدا ہو جاتی اور پڑھنے والے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے''۔ (۲۳)

کلیم الدین احمد نے تبصرہ نگار کا اصلی فرض غیر جانب داری کا برتنا بتایا ہے (۲۴) اور

شمس الرحمان فاروقی نے تبصروں میں مبالغہ آمیز تعریف اور مضحکہ آمیز تنقیص کو تبصرہ کا نقص قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ہمارے تبصروں میں ''کتاب اردو ادب میں اضافہ ہے، لازوال ہے، غیر معمولی کارنامہ ہے، شاعر/افسانہ نگار/تنقید نگار نے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے، فنی نزاکتیں اور باریکیاں موصوف پر ختم ہوجاتی ہیں وہاں ایسے بھی خشم ناک اور سنگین فیصلے دکھائی دیتے ہیں، مصنف جاہل ہے، شاعری تنقید، افسانہ نگاری کے فن سے قطعاً بے گانہ ہے، وغیرہ وغیرہ (۲۵)، مولانا اصلاحی کے ان تبصروں میں کہیں بھی ایک لفظ ایسا نہیں ہے جس سے مبالغہ آمیز تعریف یا مضحکہ آمیز تنقیص ظاہر ہوتی ہو اور غیر جانب دارانہ اصولوں کو پیش نظر نہ رکھا گیا ہو۔

معارف میں ''باب التقریظ والانتقاد'' کے تحت کسی اہم کتاب یا اہم رسالہ کے خاص نمبروں پر تفصیلی نقد و تبصرہ ہوتا ہے، ان تبصروں میں بے لاگ رائے کا اظہار کیا جاتا ہے اور تنقیص و تعریض سے دور رہ کر خالص سنجیدہ اسلوب اور علمی انداز میں کتاب کے محاسن و نقائص کی نشان دہی کی جاتی ہے (۲۶)، باب التقریظ والانتقاد کے تحت مولانا اصلاحی کے قلم سے سب سے پہلا تبصرہ نومبر ۱۹۵۷، جلد ۸۰، میں شائع ہوا۔

بعد میں رسالہ ''فاران'' (توحید نمبر) الفرقان (افادات گیلانی نمبر) سہ ماہی العلم (جنگ آزادی نمبر) آج کل (جنگ آزادی نمبر) فروغ اردو (جنگ آزادی نمبر)، دور جدید رنگون (گیارہواں سال گرہ نمبر) تعمیر انسانیت لاہور کا سالنامہ اور نئی نسلیں (خاص نمبر) پر مولانا اصلاحی کے تبصرے شائع ہوئے۔

''افکار سہیل''، شبلی کالج میگزین کے خصوصی شمارے افکار سہیل کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ نمبر اردو کے مشہور شاعر و ادیب اور علامہ شبلی کے شاگرد اقبال سہیل کے افکار و حیات پر مشتمل ہے، اس کے دو حصے ہیں، حصہ اول میں کئی مفید مقالے ہیں جن سے سہیل صاحب کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ دوسرا حصہ بڑا قیمتی اور یہی دراصل اس نمبر کی جان ہے جو مولانا سہیل کے بلند پایہ علمی، ادبی اور تنقیدی مقالات، خطبات اور مکتوبات پر مشتمل ہے، سہیل صاحب اپنی افتاد طبع کی بناء پر بہت کم لکھتے تھے مگر جو کچھ لکھتے تھے وہ ادب عالیہ کی حیثیت رکھتا تھا، اس حصے میں اصغر گونڈوی کے مجموعہ کلام ''نشاط روح'' پر سہیل صاحب کا

مقدمہ ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، اس سے سہیل صاحب کی علمی قابلیت اور علم وادب میں ان کی وسعت ودقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی یہ صلاحیتیں اگر علم وادب کی خدمت میں صرف ہوئی ہوتیں تو ہندوستان کے بلند پایہ اور صاحب طرز مصنّفین میں ان کا شمار ہوتا (۲۷)، اس کے بعد مولانا اصلاحی نے سہیل صاحب کی شخصیت کا جو مرقع اپنے مخصوص علمی انداز میں چند سطروں میں پیش کر دیا ہے اس سے سہیل صاحب کی علمی، ادبی اور اخلاقی شخصیت کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔

یہاں مولانا کی دو اہم تقریظوں کا ذکر ضروری ہے، ایک ''المرتضیٰ'' مرتبہ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور دوسری ''رقص شرر'' مصنفہ ملک زادہ منظور احمد ہے، یہ دونوں تبصرے علمی وادبی حلقے میں بڑی قدر ومنزلت اور دلچسپی سے پڑھے گئے اور المرتضیٰ پر تبصرے کی داد خود مصنف علام نے دی۔

المرتضیٰ کی ضرورت اور اس کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا اصلاحی فرماتے ہیں:

> ''حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کی طرح ان کی علاحدہ ومفصل سوانح عمری لکھنے کا اہتمام دارالمصنّفین میں نہیں کیا گیا اور قدیم طرز کی کتابوں میں صحت ووثوق کا لحاظ کیے بغیر افراط وتفریط سے کام لیا گیا ہے اس کی وجہ سے حضرت علی مرتضیٰ کی شخصیت کے حقیقی خط وخال اور اصلی تصویر دنیا کے سامنے جلوہ گر نہ ہوسکی، اس لیے ان کی ایسی مستند سوانح عمری کی ضرورت تھی جو موجودہ علمی وتحقیقی ذوق ومعیار کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہو اور اس میں بحث ونظر اور تلاش وتحقیق کا معروضی انداز اختیار کر کے مثبت اور درست نتائج تک پہنچنے کی سعی بلیغ کی گئی ہو''۔(۲۸)

مولانا ندوی کی یہ تصنیف دس ابواب پر مشتمل ہے جس میں مصنف نے حضرت علیؓ کی سیرت وشخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی سعی بلیغ کی، مولانا اصلاحی نے چند سطروں میں اس کا تذکرہ کرنے کے بعد حضرت علیؓ کی زندگی کے بعض مباحث جیسے امامت وخلافت، مسئلہ خلافت میں خلفاء کی ترتیب، انتخاب خلفاء میں تعجیل کے اسباب، خلافت کی اہلیت، واقعہ کربلا

وغیرہ پر مولانا ندوی کے خیالات کا استقصا اور محاکمہ جامعیت و اختصار سے پیش کیا، مثلاً ایک جگہ خلافت کی اہلیت وصلاحیت پر مولانا ندوی کی بحث کا ذکر کرتے ہیں:

فاضل مصنف نے خلافت کی اہلیت وصلاحیت پر اچھی بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر سے زیادہ اس وقت بار خلافت اٹھانے کا کوئی دوسرا شخص اہل نہیں تھا، ان کی بحث و تحقیق سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت کے مسئلہ میں امت کے سواد اعظم کا موقف ہر اعتبار سے معقول و مناسب تھا، خلافت وامامت کے اس طرح کے پیچیدہ اور نازک مباحث کو حل کر کے مصنف نے وہی خدمت انجام دی ہے جو اپنے اپنے دور میں متکلمین انجام دیتے رہے ہیں''۔(۲۹)

بعض امور کی جانب انہوں نے اس انداز سے توجہ دلائی:

''کتاب میں بعض چیزوں کی تحقیق میں کدو کاوش کی گئی ہے اور بعض واقعات کے صحیح زمانہ کا تعین کیا گیا ہے، اہم اور قابل غور باتوں کی نشان دہی کر کے ان کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے، بعض جگہ مختلف اقوال ودلائل میں محاکمہ کر کے مرجح قول کی تعیین کی ہے، یہ اور اس طرح کی گوناگوں خوبیوں کے باوجود اس میں بعض امور قابل توجہ ہیں''۔(۳۰)

مولانا اصلاحی کی تصریح کے مطابق حضرت ابوبکرؓ سے حضرت علیؓ کی بیعت کا بیان مختصر ہے، اس نازک اور تفصیل طلب بحث کا حق مولانا ندوی کے مجمل اشارات سے ادا نہیں ہوسکتا، اس سلسلہ کی تمام روایتوں پر نقد وتبصرہ کر کے صحیح فیصلہ اور درست نتیجہ بیان کرنا چاہیے تھا، اسی طرح باغ فدک اور اراضی خیبر جیسے مابہ النزاع مسئلہ میں محتاط انداز کی بحث سے سرسری گزر جانا اور دونوں فریقوں کو مجتہد بتانا، معروضی اور علمی طریقہ اسلوب کے منافی ہے، حضرت علی کی اولاد کا تذکرہ بھی ناکافی ہے، اس سے حضرت فاطمہؓ کے علاوہ دوسری بیویوں اور ان کی اولاد کا پتہ نہیں چلتا، امیر المومنین کے فضائل ومناقب کا حصہ بھی تفصیل کا متقاضی تھا، حضرت علیؓ کے اخلاق و عادات، ان کی خاندانی اور معاشرتی زندگی اور اپنے مخالفین کے ساتھ برتاؤ کی تفصیل کما حقہ مذکور

نہیں، غدیر خم پر بعض محدثین نے کلام کیا ہے، اس کے محاکمہ اور حضرت طلحہؓ کی شہادت پر مشتمل روایتیں محتاج بحث وتنقید تھیں، بعض نازک معاملہ پر مولانا ندوی نے محض ایک ہی دو کتابوں پر اعتماد کرلیا ہے جس سے واقعات کی یک رخی تصویر ہی سامنے آتی ہے، مختلف فیہ اقوال میں ترجیح و محاکمہ نہ کرنے کی وجہ سے مصنف کے اصل موقف کا بھی علم نہیں ہوتا، کہیں کہیں غیر ضروری تفصیل دی گئی ہے مثلاً حضرت علیؓ کے مخصوص تذکرہ میں خلفائے ثلاثہ اور اجلہ صحابہ کے ذکر کے بجائے ان واقعات کا ذکر جن کا حضرت علیؓ سے براہ راست تعلق نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔

عبدالمطلب کے ذکر میں لکھا گیا کہ بیت اللہ سے تعلق اور وابستگی کی بنا پر عبدالمطلب ہی مکہ اور بیت اللہ کے معاملات میں گفتگو کرنے کی غرض سے ابرہۃ الاشرم کے پاس گئے تو ابرہہ سے انہوں نے صرف اپنے دوسو اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا جب کہ وہ مکہ اور بیت اللہ کے معاملات پر گفتگو کرنے گئے تھے اور مولانا ندوی ہی کے بقول ''جب عبدالمطلب نے صرف اپنے اونٹوں کا مطالبہ کیا تو ابرہہ نے اس پر یہ عار دلا کر کہا کہ تم کو صرف اپنے اونٹوں کی فکر ہے اور کعبہ کی کوئی پرواہ نہیں، ابرہہ کے عار دلانے پر بھی عبدالمطلب نے یہ فرمایا کہ اونٹوں کا مالک میں ہوں اور کعبہ کا مالک اللہ ہے، وہی اس کو بچائے گا''۔

مولانا اصلاحی نے یہاں سوال قائم کیا کہ آخر عبدالمطلب نے یہ غیر متعلق گفتگو کیوں کی؟ یہ عجیب بات ہے کہ جو گھر خدا کے نزدیک اس قدر محترم ہو اور جس کو نہ صرف عبدالمطلب بلکہ قبیلۂ قریش اور اہل مکہ نہایت محبوب رکھتے ہوں اور اس پر جان چھڑکتے ہوں اور جس گھر کی بدولت عبدالمطلب قوم میں معزز اور سربرآوردہ خیال کیے جاتے تھے مگر جب اسے ڈھانے کے لیے ابرہہ کا لشکر آیا تو عبدالمطلب اور اہل مکہ میں کوئی غیرت وحمیت اور جوش و ولولہ پیدا نہیں ہوا اور انہوں نے اس کی مدافعت تو درکنار اس کے مسئلہ پر ابرہہ سے کوئی بات چیت بھی نہیں کی جس کے لیے بقول مصنف اس کے پاس گئے تھے، ان تمام سوالوں کے جوابات سے مولانا ندوی کی کتاب خالی ہے۔(۳۱)

المرتضیٰ کے اردو مترجم جناب مولانا عبداللہ عباس کے حاشیے اور ترجمے کی بعض غلطیوں کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ ترجمہ میں بھی عبید اللہ بن زیاد کو مجہول النسب لکھنا

محل نظر ہے، رہے زیاد بن سمیہ تو ان کا بھی امیر معاویہؓ نے استلحاق کرلیا تھا، مترجم نے ابن زیاد کو صرف زیاد لکھا ہے، مصنف نے بعض کبار صحابہ کے ناموں کی فہرست میں مروان کا نام بھی لکھا ہے، مترجم نے بہ شمول مروان ان سب کو جلیل القدر صحابہ بتایا ہے، جلیل القدر ہونا تو درکنار مروان کا صحابی ہونا بھی مسلم نہیں۔(۳۲)

یہاں یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ مروان کے صحابی ہونے کے متعلق مولانا اصلاحی کا موقف درست نہیں ہے، ابن حجر عسقلانی نے مقدمہ فتح الباری میں جہاں رواۃ بخاری کا ذکر کیا ہے، اس میں مروان بن الحکم نام بھی شامل کیا ہے اور ان کے متعلق عروہ بن زبیر کا قول نقل کیا ہے کہ حدیث کے سلسلہ میں مروان کو متہم نہیں کیا جاسکتا، سہیل بن سعد صحابی کا بھی ان کے متعلق یہی قول ہے اور وہ بھی ان کے صدوق ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔

ابن کثیر نے مروان کو صحابی لکھا ہے، ان کی تحقیق کے مطابق مروان رسول اللہ کی حیات طیبہ میں پیدا ہوئے اور صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں ان کی حدیث بھی مروی ہے اور بخاری میں بھی ایک روایت ان سے مروی ہے۔

جمہور محققین میں اکثر نے مروان کو صحابی تسلیم کرلیا ہے، دور جدید کے مشہور محقق پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحب کی بھی تحقیق یہی ہے، ان کی صحابیت اب غیر متحقق اور مشکوک نہیں رہی، البتہ حضرت طلحہ جیسے جلیل القدر صحابی کے خون سے ان کا دامن داغ دار ہے اس لیے ان کی عظمت و بلند پائیگی کو وہ مقام نہیں دیا جاسکتا جس پر دوسرے اجلہ صحابہ فائز ہیں۔

مذکورہ بالا تسامحات کی جانب مصنف محترم مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی توجہ ملتفت کرانے سے المرتضیٰ کے اگلے ایڈیشن میں بعض غلطیوں کی تصحیح کردی گئی۔

''رقص شرر'' مرتبہ ملک زادہ منظور احمد پر مولانا اصلاحی کا مفصل تبصرہ معارف جون ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا، مولانا اصلاحی نے اس پر اظہار خیال کے لیے ادبی پیرایہ بیان اختیار کیا ہے لیکن ادیبانہ شان پیدا کرنے کے لیے مولانا اصلاحی نے اپنی ناقدانہ صلاحیت کو قربان نہیں کیا اور یہ تبصرہ ۱۶ صفحوں پر مشتمل ہے، شروع میں لکھتے ہیں:

''پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز اور پرشور

رہی ہے، یہ کتاب ان کی اسی اضطراب و کشاکش سے بھری اور ہنگامہ لطف و طرب سے معمور زندگی کی سرگذشت ہے، ان کا اصلی مشغلہ درس و تدریس تھا مگر ان کی شورشِ عمل اور تگ و تاز کی جولان گاہیں اور بھی ہیں، ان کی پرواز کی حدود شعر و ادب، معاشرت اور سیاست کے مسائل اور سرگرمیوں تک وسیع ہیں، اردو زبان سے ان کو عشق ہے...... گزشتہ پچاس برسوں سے وہ اردو کے ادبی افق پر چھائے ہوئے ہیں اور ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے ان کو عالمی شہرت حاصل ہے ...... ان کی مصلحت نا آشنا طبیعت کو سمجھوتے اور مفاہمت کے بجائے کشمکش اور مزاحمت پسند ہے جو حقائق کی راہ میں حائل ہر سنگ گراں پر تیشہ چلانے سے کم پر راضی نہیں ہوتی''۔(۳۴)

ملک زادہ صاحب کی شخصیت کی اس مرقع کشی کے بعد کتاب کے تعارف پر مشتمل یہ جملے کس قدر ادبی چاشنی و لطافت سے مملو ہیں:

''اس سرگذشت میں سارے پیچ و خم اور قومی و سیاسی زندگی کے مد و جزر آ گئے ہیں، اس سے اردو کے لیے ملک زادہ صاحب کے مجاہدانہ جوش و ولولہ، شعر و ادب سے ان کے تعلق اور دلچسپی کی کیفیت اور ملک و بیرون ملک مشاعروں کا حال معلوم ہوتا ہے جن میں ان کا مرکزی کردار رہا ہے، اس سے ارباب سیاست کی شعبدہ بازی، اردو کے ساتھ حکومتوں کی طوطا چشمی اور سوتیلے برتاؤ، دفاتر اور تعلیمی محکموں کا معاندانہ رویہ اور یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اس کے اور اردو کے ساتھ دوہرا معیار اور خود اردو والوں کی کوتاہی اور بے حسی سامنے آ جاتی ہے جس کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے جو دلچسپ ہونے کے باوجود ایک پُر درد صحیفۂ عبرت بن گیا ہے، ملک زادہ صاحب کے اس آئینۂ تحریر میں جہاں قومی و سیاسی کارکنوں اور شاعروں کے خوب و ناخوب کردار، سماج کی بے اعتدالی، سیاست کی کثافت، اردو کی بدحالی، اردو شاعری اور مشاعروں کے تنزل و انحطاط کی تصویر دکھائی دیتی ہے، وہاں خود ان کی زندگی کا

خوب وزشت اور سیرت وشخصیت کا روشن اور ناہموار پہلو بھی نظر سے اوجھل نہیں رہتا''۔(۳۴)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ملک زادہ صاحب نے اپنے حلقہ تعارف کی وسعت کا ذکر بار بار کیا ہے اور مرکزی اور صوبائی وزیروں سے اپنی ملاقات اور تعلقات کی داستان بھی سنائی ہے لیکن ایسے بااثر لوگوں سے تعلق سے جس مشن کے وہ علم بردار تھے اس کو کیا فائدہ ہوا، فائدہ تو کیا ہوتا انہوں نے اس کا بھی ذکر نہیں کیا کہ اپنی کسی مہم کے سلسلہ میں ان سے کوئی مدد چاہی ہو''۔(۳۵)

آخر میں یہاں اس خط کا تذکرہ بھی مناسب سمجھتا ہوں جو معارف (اپریل ۲۰۰۸ء) میں مولانا اصلاحی کے حادثہ جاں کاہ کے بعد شائع ہوا، اس خط میں مولانا عبدالعلی فاروقی صاحب نے لکھا ہے کہ صبرحد کے کسی پروگرام میں دونوں کی ملاقات ہوئی تو مولانا عبدالعلی صاحب نے مولانا عبدالشکور فاروقی صاحب کی کتاب ''شیعہ اور قرآن، معروف بہ تنبیہ الحائرین'' پر تبصرہ کی کسی غلطی کا ذکر کیا تو مولانا اصلاحی نے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ''واقعی یہ میری غلطی ہے کہ پوری کتاب کا مطالعہ کیے بغیر ہی میں نے اس پر رواں تبصرہ کردیا''۔(۲۸۷)

یہاں مولانا اصلاحی کا تبصرہ نقل کردینا مناسب ہے تاکہ اس زبانی گفتگو کے متعلق مولانا اصلاحی کے مذکورہ تواضع وانکسار کے باوجود ان کی نظر اور اصابت رائے کا اندازہ ہوجائے کہ ''رواروی'' کے عالم میں بھی یہ تبصرہ کس درجہ وقیع اور چشم کشا ہے اور زیر تبصرہ کتاب کے قاری کو کتاب کی اہمیت کے ساتھ موضوع کی نزاکت کا کس درجہ احساس دلاتا ہے۔

''مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی ممتاز علماء میں تھے، ردشیعیت ان کا خاص مشن تھا، یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو پنجاب کے ایک شیعی عالم مولانا سید علی حائری کے جواب میں لکھی گئی تھی اور پہلے قسط وار رسالہ النجم میں شائع ہوئی تھی، پھر اس کے کتابی صورت میں متعدد ایڈیشن چھپے، یہ نیا ایڈیشن ہے، اس میں شیعوں کے متعدد اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے لیکن اس کی زیادہ

اہم بحثیں دو ہیں، ایک تو یہ کہ شیعوں کے نزدیک قرآن مجید میں ہر نوعیت کی تحریف ہوئی ہے، اس لیے نہ اس پر ان کا ایمان ہے اور نہ ہوسکتا ہے، دوسری بحث میں ان کے اس الزام کی تردید ہے کہ اہل سنت کے یہاں بھی تحریف قرآن کا عقیدہ موجود ہے مگر شیعہ محققین اپنی جانب تحریف قرآن کی نسبت تسلیم نہیں کرتے، یہ ان کے بعض غالی فرقوں کا ضرور عقیدہ تھا مگر اس زمانہ کے اکثر شیعوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس بنا پر عام اہل سنت ان کی تکفیر نہیں کرتے، بلکہ انہیں امت کا ایک فرقہ سمجھتے ہیں اور فرق و مذاہب کی کتابوں میں بھی ان کا اسلامی فرقہ ہی کی حیثیت سے تذکرہ کیا گیا ہے، سنیوں اور شیعوں کا بڑا اور بنیادی اختلاف مسئلہ خلافت و امامت میں بتایا جاتا ہے نہ کہ تحریف قرآن کے عقیدہ میں۔ اس سلسلہ میں جو روایتیں نقل کی ہیں وہ وضعی معلوم ہوتی ہیں، ثانیاً جمہور اور محققین علمائے شیعہ ان سے برأت ظاہر کرتے ہیں، اب اس قسم کی مناظرانہ بحث کا زمانہ نہیں رہا کیوں کہ اس سے خواہ مخواہ تلخی پیدا ہوتی ہے، اس لیے دونوں فرقوں کو موجودہ حالات کے پیش نظر امت میں افتراق و انتشار پیدا کرنے والی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے''۔(۳۶)

حوالے

(۱) اردو تنقید کا ارتقاء، ص ۴۵۹، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سود لیتھو پریس، دہلی۔ (۲) مقالات حالی حصہ دوم، تقریظ سیرۃ النعمان، ص ۱۶۴-۱۶۵، مطبوعہ جامع پریس دہلی، ۱۹۳۶ء۔ (۳) مکاتیب شبلی جلد دوم، مکتوب نمبر: ۱، ۸رمئی ۱۸۹۰ء، ص ۲۲۴، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، ۱۹۱۷ء۔ (۴) ایضاً جلد اول، ۱۰رجولائی ۱۸۹۹ء، ص ۱۱۵، ۱۹۶۶ء۔ (۵) ایضاً، ۲۶رجولائی، ص ۱۱۸۔ (۶) ایضاً، جلد دوم، ص ۱۷۲، مکتوب بنام مولانا عبدالسلام ندوی، ۱۶رمئی ۱۹۰۷ء۔ (۷) علامہ سید سلیمان ندوی، شخصیت و ادبی خدمات، ص ۳۹۳، آفسیٹ پریس گورکھ پور، ۱۹۸۵ء بار اول۔ (۸) ایضاً، ص ۳۹۱۔ (۹) اردو تنقید کا ارتقاء، ص ۴۵۷ تا ۴۶۳۔ (۱۰) ص ۵۹، جلد اول، عدد ۱۔ (۱۱) شعر، غیر شعر اور نثر، ص ۲۲۷، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،

نئی دہلی، ۲۰۰۵ء۔(۱۲) ایضاً،ص ۲۴۸۔(۱۳) اردو تنقید پر ایک نظر،ص ۳۰۲ - ۳۰۵، ۱۹۶۹ء۔ (۱۴) شعر، غیر شعر اور نثر،ص ۲۹۱۔(۱۵) اردو تنقید پر ایک نظر،ص ۳۰۲ - ۳۰۵۔(۱۶) معارف مارچ ۱۹۵۸ء، جلد ۸۱،ص ۲۳۷۔(۱۷) ایضاً۔(۱۸) ایضاً،ص ۲۳۹۔(۱۹) ایضاً۔(۲۰) ایضاً،ص ۲۴۰۔ (۲۱) ایضاً۔(۲۲) ایضاً، اپریل ۱۹۵۸ء،ص ۳۱۷۔(۲۳) ایضاً،ص ۴۸۰۔(۲۴) اردو تنقید پر ایک نظر، ص ۳۰۲ - ۳۰۵، ۱۹۶۹ء۔(۲۵) شعر، غیر شعر اور نثر،ص ۲۸۵۔(۲۶) علامہ سید سلیمان ندوی، شخصیت و ادبی خدمات،ص ۳۹۱۔(۲۷) معارف، فروری ۱۹۵۸ء، ج ۸۱،ص ۱۵۵ - ۱۵۶۔(۲۸) معارف، جون ۱۹۸۹ء،ص ۴۵۹۔(۲۹) ایضاً،ص ۴۶۹۔(۳۰) ایضاً،ص ۴۷۰۔(۳۱) ایضاً،ص ۴۷۶ - ۴۷۷۔ (۳۲) معارف جون، ۱۹۸۹ء،ص ۴۷۶ - ۴۷۷۔(۳۳) معارف جون، ۲۰۰۵ء،ص ۴۵۸۔(۳۴) ایضاً، ص ۴۵۹ - ۴۶۰۔(۳۵) ایضاً،ص ۴۷۲۔(۳۶) معارف مارچ ۱۹۸۳ء،ص ۲۳۵ - ۲۳۶۔

اخبار علمیہ

واشنگٹن کے بروکنگ انسٹی ٹیوشن کی ایک شاخ قطر میں بروکنگ دوحہ سینٹر کے نام سے ہے، اس نے اسلامی مدارس کا ایک جائزہ لیا، تازہ جائزے میں کہا گیا ہے کہ بنگال کے دینی مدارس میں اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ عصری اور سائنسی علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں، معیاری تعلیم کے سبب غیر مسلم، قبائلی اور عیسائی طلبہ بھی زیر تعلیم ہیں، بنگال کے وزیر عبدالستار کے مطابق ان مدارس میں ۱۷ر فیصد طلبا غیر مسلم ہیں، بنگال کی کمیونسٹ حکومت کو اس سلسلہ میں بیرونی ممالک سے تعاون بھی حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ بنگال کی دیگر عصری درس گاہوں سے یہ مدارس کم نہیں، ریاستی حکومت کی سرپرستی میں ۴۷۴ دینی مدارس ہیں جہاں جدید اسکولی نصاب رائج ہے، ۱۰۲ مدرسوں میں اسلامیات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ان مدارس میں ۱۱ر فیصد غیر مسلم ہیں، بعض غیر مسلم طلبہ کا بیان ہے کہ ان مدرسوں میں حصول تعلیم کے بعد ہمیں اسلام کے تئیں پھیلائی گئی غلط فہمیوں کا اندازہ ہوا اور ہماری سوچ میں مثبت تبدیلی آئی۔

''کامن گراؤنڈ نیوز'' کی اطلاع کے مطابق مصر، مراکش اور ترکی حکومتوں نے اس تصور کو غلط ثابت کرنے کی ٹھانی ہے کہ عورتوں میں مذہبی قیادت کی اہلیت نہیں ہوتی اور یہ تبلیغ کے فرائض بحسن وخوبی ادا نہیں کرسکتیں، ان ملکوں میں ان عورتوں کو ''مرشدات'' کہا جاتا ہے جو یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ قرآن، حدیث اور فقہ میں مہارت رکھتی ہیں، یہ معاشرہ میں خصوصاً ہم جنسوں میں جا کر انتہا پسندی کے سد باب اور جمہوری اقدار کے فروغ کی کوششوں میں مصروف ہیں، ایک مرشدہ سیدی کے مطابق ان مرشدات کی تقرری معاشرتی انقلاب کی طرف ایک اہم پیش رفت ہے، مذہبی امور میں خواتین کا دخل بعض حلقوں میں ناپسندیدہ ہے لیکن دوسری جانب ان کو تائید بھی حاصل ہے، رپورٹ کے مطابق پچاس تربیت یافتہ خواتین کو حال ہی میں قاہرہ، غزہ اور اسکندریہ کے نواحی علاقوں میں وہاں کی عام خواتین کی رہنمائی کے لیے تقرر کیا گیا ہے۔

امریکا میں ''مذہب پر عالمی پابندیاں'' پر مشتمل ایک جائزہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان

کے رہنما اور یہاں کی اکثریت ملک کو سیکولر اور مذہبی رواداری کا گہوارہ مانتی ہے لیکن بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کی شناخت فرقہ پرستی اور مذہبی منافرت پھیلانے والے ملک کی حیثیت سے ہے جہاں اقلیتوں کو مکمل طور پر مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے، رپورٹ میں گجرات اور اڑیسہ کے اقلیت مخالف فسادات کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ پیو ریسرچ سینٹر کی اس رپورٹ میں ہندوستان کو دوسرا اور عراق کو پہلا مقام یہ کہہ کر دیا گیا ہے کہ وہاں سب سے زیادہ مذہبی پابندیاں عاید ہیں اور اقلیتوں کے ساتھ مذہبی تعصب برتا جاتا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا کے مطابق اسرائیل کے ایک محقق گرشن گیلل نے بائیبل سے متعلق عبرانی زبان کا کتبہ پڑھ کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ وہ عام تصور کے برخلاف سینکڑوں برس پہلے لکھی جا چکی تھی، اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ دسویں صدی قبل مسیح اسرائیلی سلطنت موجود تھی، اب تک محققین کا خیال اور اصرار ہے کہ بائیبل کا چھ صدی قبل مسیح لکھا جانا ممکن نہیں لیکن جنوبی اسرائیل میں واقع یونیورسٹی آف یافہ کے محقق نے چکنی مٹی کے اس ایک چھوٹے ٹکڑے کو پڑھنے کے بعد کہا کہ یہ محققین اندھیرے میں تھے اور اس سے دسویں صدی قبل مسیح اسرائیلی (یہودی) سلطنت کے وجود سے بھی پردہ اٹھتا ہے۔

کونسل فار سوشیل جسٹس اینڈ پیس، گوا کی شائع کردہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ہر سال جو اسرائیلی سیاح گوا آتے ہیں ان کی اکثریت کے ہاتھ بے گناہ فلسطینیوں کے فرضی انکاؤنٹر اور عام جرائم سے آلودہ ہوتے ہیں، غیر انسانی اعمال کے ارتکاب سے اسرائیلی فوجی نفسیاتی اور ذہنی امراض کے شکار ہو کر جارحانہ تیور اختیار کر لیتے ہیں تو اسرائیلی وزارت دفاع انہیں اس مرض سے نجات حاصل کرنے کے لیے بہ غرض تفریح گوا اور دوسرے تفریحی مقامات پر اپنے خرچ پر بھیج دیتی ہے، رپورٹ کے مطابق وہ جہاں جاتے ہیں وہاں کے مقامی افراد کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں اور دہشت گردی، غنڈہ گردی، عصمت فروشی اور آزادانہ جنسی بے راہ روی اور منشیات کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں لہذا حکومت ہند کو اپنے ملک اور غیر قانونی کاموں سے حفاظت کے لیے اسرائیل کے ان بگڑے فوجیوں پر سخت نظر رکھنے کی ضرورت ہے تا کہ ہندوستان کا امن وسکون غارت ہونے سے محفوظ رہے۔ واضح رہے کہ یہ رپورٹ خود عیسائی پادریوں کی تیار کردہ ہے۔

کوریا ٹائم کی خبر ہے کہ جنوبی کوریا کے سائنس دانوں نے انسان نما روبوٹ تیار کرلیا ہے جو عام آدمیوں کی طرح گھومتا پھرتا، گھر کی صفائی اور واشنگ مشین میں کپڑے بھی دھلتا ہے، اس کو دیکھنے کے بعد انسانوں کی حیرت انگیز قوتِ اختراع کا اندازہ ہوتا ہے۔

ملیشیا کے محکمۂ اسلامی ترقیات کے ''ہجرت نبوی ایوارڈ'' کا آغاز ۱۹۸۷ء میں ہوا، یہ ہر سال اسلام اور مسلمانوں کی بے لوث خدمات کے اعتراف میں ممتاز شخصیتوں کو دیا جاتا ہے، اس سے قبل مصر کے معروف عالم شیخ محمد ادریس المار بائے، انڈونیشیا کے سابق وزیر حج و مذہبی امور منور شزالی اور شام کے مفکر وہبان زہیلی کو اس اعزاز سے نوازا جاچکا ہے، اس بار عالم اسلام کے ممتاز اسکالر و مفکر علامہ یوسف القرضاوی کو ان کی خدمات جلیلہ کے اعتراف میں یہ اعزاز دیا گیا ہے۔

ماضی میں جانوروں کی نسلوں مثلاً ڈائنا سور وغیرہ کے خاتمہ پر کی گئی تحقیقات کو بنیاد بنا کر سائنس دانوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ موسمیاتی تغیر و تبدل ہی اصلاً ان کے خاتمہ کا سبب رہا ہے، اس ضمن میں انہوں نے جانوروں کے تحفظ کے لیے کی جانے والی موجودہ کوششوں کو اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ جانوروں کی زندگی بچاؤ تحریک میں ان کوششوں سے مدد ملے گی۔ محققین نے اپنی تحقیقات کا مرکز بحری جانوروں کو بنایا ہے بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ قدیم جانوروں پر کی گئی تحقیقات ان کے خاتمہ کے اسباب اور طرز و انداز کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہیں، تبدیلی کا منفی اثر جب ایک نسل پر پڑتا ہے تو اس سے مشابہ دوسری نسلیں بھی متاثر ہوتی ہیں، آبی پرندوں کی پوری نسل موسمیاتی تغیر کے سبب قریب الختم ہے۔ لہذا ماہرین موسمیات کو اس جانب خصوصی توجہ دینا ہوگی۔

ڈیوک یونیورسٹی پریس امریکہ نے چھوٹی بچت اور سرمایہ کاری کے موضوع پر ایک کتاب شائع کی ہے، یہ اصلاً ایک تحقیقی مقالہ ہے جو امریکی صدر بارک اوبامہ کی والدہ نے اس وقت لکھا تھا جب وہ انڈونیشیا میں دیہی ترقیات کے پروجیکٹ پر کام کررہی تھیں، ہوائی یونیورسٹی نے انہیں اس پر ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی تھی، واضح رہے کہ ان کا انتقال ۱۴؍سال قبل ۱۹۹۵ء میں ہوا۔

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

مکتوب نئی دہلی

۶۲۵، این/۳۱، بٹلہ ہاؤس،
جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
۱۰/۱/ ۲۰۱۰ء

مکرمی جناب مرتب صاحب، ماہنامہ معارف اعظم گڈھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف ماہ دسمبر ۲۰۰۹ء موصول ہوا، یادآوری کا شکریہ۔

صفحہ ۴۷۴ پر جناب ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی صاحب کا مکتوب علی گڑھ اگرچہ پروفیسر ظلی صاحب کے نام ذاتی نوعیت کا ہے مگر جب شائع ہوگیا تو ہر قاری کو اس پر اظہار خیال کا حق حاصل ہے، لہذا اس سلسلہ میں عرض ہے کہ موصوف نے صوفیائے کرام کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ حقیقت سے بہت دور معلوم ہوتے ہیں۔

اصل میں معترض نے اپنے مفروضہ خیالات کی بنیاد جس نقطہ کو بنایا ہے وہ ہے ''عرفان یا معرفت کا تعلق دیکھنے سے ہے'' قطعی غلط ہے، عرفان کے معنی جاننا پہچاننا ہیں جیسا کہ مصباح اللغات میں ہے اور القاموس الوحید نے تو اس کو اور واضح کردیا ہے، اس نے لکھا ہے، عرف - کسی حاسّہ کے ذریعہ جاننا، شناخت کرنا، پہچاننا، یہی معنی احادیث مبارکہ میں مراد لیے گئے ہیں۔ من عرف نفسه فقد عرف ربه، جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

بخاری شریف جلد اول کے باب اطعام الطعام من الاسلام میں روایت ہے:

ای الاسلام خیر قال تطعم الطعام و تقرأ السلام علی من عرفت ومن لم تعرف، حضورؐ سے جب سوال کیا گیا کہ اسلام کا بہترین کام کیا ہے تو آپ نے فرمایا، کھانا کھلاؤ اور ہر آدمی کو سلام کرو چاہے تم اسے پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو، اسی طرح بخاری شریف باب قول النبیؐ

کی اس روایت میں: انـا اعـلـمكم باللّٰه وان المعرفة فعل القلب، آنحضرتؐ کا فرمان کہ میں تم میں سب سے زیادہ اللہ کا جاننے والوں ہوں اور معرفت تو دل کا فعل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے یہاں معرفت دیکھنے کے معنی ہی نہیں بلکہ دل سے اس کا شعور حاصل کرنا، محسوس کرنا اور سمجھنا مراد ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی سورۃ الحجر آیت ۹۹ میں واعبد ربك حتى ياتيك اليقين میں آنحضرتؐ کو ظاہری پریشانیوں سے فکرمند نہ ہونے کے لیے کہا جارہا ہے کہ تم اپنے رب کی عبادت کیے جاؤ یہاں تک کہ یقینی کیفیت پیدا ہوجائے یعنی موت آجائے مطلب یہ کہ آخری سانس تک عبادت کا عمل جاری رکھنا ہے۔ یہاں یقین کے مفہوم پر اکثر مفسرین نے تو موت ہی مراد لیا ہے لیکن شیخ الہند مولانا محمود حسن نے اس لفظ کی تشریح میں فرمایا ہے کہ یقین سے عارفین نے قلبی وجدان مراد لیا ہے۔

اب یہاں وجدان کے لفظ نے پھر ایک سوال پیدا کردیا ہے کہ وجدان کا مفہوم کیا ہے۔ اس سلسلہ میں حجۃ اللہ البالغہ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعہ جلد دوم میں مفتی سعید احمد پالن پوری نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا مبسوط نظریہ پیش کیا ہے جس کی طرف رجوع کرنا چاہیے ویسے مختصر کہا جاسکتا ہے کہ اکثر اوقات آدمی کی ذات میں ایک فطری ملکہ ہوتا ہے جس سے ہمیشہ وجدانی علم حاصل ہوتا ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ، ج دوم، ص ۴۰)

اس کے بعد معترض کے خط میں یہ جملہ ''امت کے قرآن کے ساتھ عدم اعتناء کے بہت سے اسباب میں سے یہ صوفیانہ رویہ بھی ہے جو علم وعبادت سے ہٹ کر معرفت کے نام پر بے عملی کی تربیت کا سامان فراہم کرتا ہے''۔

اس سلسلہ میں سورہ الزاریات کی آیت وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون اور میں نے جن اور انسان کو محض اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں، اس کے بارے میں مولانا اشرف علی تھانوی بیان القرآن ج ۱۱، ص ۶۳ میں لکھتے ہیں ''حضرت مجاہد سے اس کی تفسیر ليعرفون کے ساتھ منقول ہے اور اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ عبادت بدون معرفت کے معتد بہا نہیں ہوتی اور نہ معرفت بدون عبادت، اب اہل ظاہر نے صرف صورت عبادت کو لے لیا اور جاہل صوفیہ نے صرف معرفت کو''۔

اس طرح تفسیر ابن کثیر نے بھی مذکورہ آیت میں یعبدون کا مفہوم یعرفون لیا ہے اور اسی کی تائید مولانا عبدالدائم جلالی نے فرمائی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت خداوندی کے لیے معرفت الٰہی لازمی ہے، جب تک آدمی اپنی سوجھ بوجھ اور عقلی سطح کے مطابق اللہ تعالیٰ کو جانے اور سمجھے گا نہیں وہ اس کی عبادت کی طرف رجوع کیسے ہوگا، یہاں عبادت کے لیے خدا کو دیکھنا شرط نہیں ہے، نہ معرفت کے معنی دیکھنا ہیں، صرف کائنات میں پھیلی ہوئے بے شمار نشانیوں کو دیکھ کر باری تعالیٰ کی ذات اقدس کو پہچاننا ہے اسی کی دعوت قرآن میں جابجا موجود ہے۔

اب رہی یہ بات کہ صوفیوں کا رویہ علم وعبادت سے ہٹ کر معرفت کے نام پر بے عملی کی تربیت کا سامان کرتا ہے، عرض ہے کہ معترض ایک بار پھر قدیم اور جدید صوفیوں کے حالات کا مطالعہ فرمائیں پھر فیصلہ کریں۔ عرض ہے کہ تصوف اور صوفی کا مقصد ''خدا کے لیے جینا ہے، مگر خدا کے لیے جینے کے معنی یہ نہیں کہ انسان دنیا ومافیہا سے قطع تعلق کر لے اور ایک گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر عبادت کرنے لگے، وہ شادی بھی کرے، کھائے بھی، اللہ کی مخلوق سے بھی ملے لیکن اس طرح کہ وہ علائق کے ہجوم اور تعلقات کے ازدحام میں گرفتار ہوکر اپنے معبود حقیقی کو نہ بھول جائے، اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے مستفید ہو لیکن دنیا کی محبت اس کے دل میں جگہ نہ حاصل کرنے پائے'' (تاریخ مشائخ چشت، خلیق احمد نظامی، ص ۳۶)۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے قیامت کے بازار میں دلوں کو راحت پہنچانے سے زیادہ کسی چیز کی قدر نہ ہوگی''۔ (بحوالہ مذکورہ، ص ۴۷)

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا معمول تھا لوگوں سے خندہ پیشانی کا برتاؤ، کسب حلال، بندگان خدا پر توسع (حوالہ سابق، ص ۲۷۰)، جہاں تک علم کا تعلق ہے حضرت محبوب الٰہی باقاعدہ عالم دین تھے اور بدایوں میں آپ کی دستار بندی ہوئی تھی۔

موجودہ دور کے جن صوفیائے کرام سے میں واقف ہوں وہ سب علماء تھے اور تاحیات درس وتدریس، تصنیف وتالیف ہی میں مشغول رہے، ان میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تقریباً نوسو کتابوں کے مصنف ہیں ان کی بیان القرآن اور بہشتی زیور آج بھی پڑھی پڑھائی جاتی ہیں، شیخ الاسلام

مولانا حسین احمد مدنی نے کئی کتابیں تحریر فرمائی آپ کی خودنوشت سوانح حیات کے علاوہ درسی تقریروں پر مشتمل درس بخاری جلد اول ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی حیات الصحابہؓ اور فضائل اعمال تبلیغی جماعت کے ذریعہ دنیا بھر میں پڑھی جاتی ہے، ان کے درجنوں مختلف زبانوں میں تراجم شائع ہو چکے ہیں، اس سلسلہ میں مولانا عبدالقادر رائے پوری ، مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی، مولانا قاری صدیق باندوی، مفتی محمود صاحب رحمہم اللہ اپنے دور کے اعلیٰ درجہ کے صوفی اور اساتذۂ کرام رہے ہیں، کیا ان حضرات کی صوفیانہ خدمات اور علمی زندگی سے کسی طرح صرف نظر ممکن ہے۔ میرے خیال میں معترض نے جن صوفیہ کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے آج کل کے وہ لوگ مراد ہوں گے جنہوں نے مزارات کو ذریعہ معاش اور رسوم و بدعات کو اپنا معمول حیات بنا رکھا ہے۔

والسلام

احقر۔ بدرالدین الحافظ

مکتوب لکھنؤ

پوسٹ بکس نمبر ۹۳، لکھنؤ
۷/۱/۲۰۱۰ء

مکرمی مولانا عمیر الصدیق ندوی صاحب زید لطفہ

سلام مسنون

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ علامہ شبلیؒ کے شروع کیے ہوئے سیرت نبوی کے کام کو جدید تقاضوں کے مطابق آگے بڑھانے کا فیصلہ بڑا مبارک قدم ہے۔ یہ دارالمصنفین کی حیات نو کی نوید ہے۔ اکبری فتنہ ملکی تھا، اب اس دور کا ''یک قطبی'' فتنہ عالم گیر ہے، اس کے مقابلہ کے لیے بھی اسی قوت و وسعت سے تیاری کی ضرورت ہے۔

سیرت نبوی پر سمینار کا اعلان بہت خوش آئند ہے، خدا تعالیٰ اسے مکمل کامیابی عطا فرمائے کوشش کروں گا کہ میری بھی شرکت ہو جائے۔

والسلام

(مولانا) سلمان الحسینی (ندوی)

مکتوب علی گڑھ

میڈیکل روڈ،
نزدک اسٹیٹ بینک، علی گڑھ۔
۷رفروری ۲۰۱۰ء

محترم ظلی صاحب السلام علیکم

معارف جنوری ۲۰۱۰ء پیش نظر ہے اس میں صفحہ ۵۹ پر ایک مضمون مولانا سعید احمد اکبرآبادی پر ہے، پڑھا ماشاءاللہ خوب ہے مجھے شک عنوان دیکھ کر ہوا تھا کہ بچھراؤں کی جگہ وطن اکبرآباد لکھا ہوگا، اکبرآبادی کی نسبت پر خاموشی ہوگی مگر خدا کا شکر ہے مضمون نگار نے تفصیل اور وجہ تسمیہ تحریر کردی۔

مولانا کے بارے میں چند باتیں لکھنا چاہتا ہوں چونکہ علی گڑھ قیام کے دوران مولانا سے خوب واسطہ رہا ہے، اس خاک نشین کا واسطہ اور تعلق یہ تھا کہ مولانا اکبرآبادی اور مفتی عتیق الرحمان عثمانی کے میرے خسر صاحب مرحوم جناب قاری محمد عمر (بجنور) سے گہرے مراسم تھے برادرانہ اور گھریلو۔ مولانا سعید احمد صاحب یا مفتی صاحب جب بھی بجنور آتے ایک شب کھانا قاری صاحب کے گھر لازمی تھا۔ ایک بات جو پردۂ راز کی ہے کہ یہ دونوں حضرات مرغ کا اسٹو بنانے میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ جب تشریف لاتے تو قاری صاحب دو تندرست مرغ فراہم کردیتے اور یہ خود ذبح کرتے اور پکاتے تھے کسی کو شریک یا قریب نہیں آنے دیتے تھے مسالہ جات خود بازار سے لاتے، ایک بار میں موجود تھا۔ مرغ کے پروں میں ایک چھوٹی شیشی روغن بادام کی تھی میں نے اندازہ کرلیا کہ یہ بھی ایک جزء ہے خسر صاحب کے دو مکان تھے ایک زنان خانہ، ایک مردانہ (مہمان خانہ اور نشست گاہ) اس لیے کھانا پکانے میں قباحت نہیں تھی۔

سن تو یاد نہیں رمضان جنوری فروری میں تھے یا دسمبر جنوری میں علی گڑھ میں چاند ۳۰ کا تسلیم کیا گیا دیگر جگہوں پر ہفتہ عشرہ بعد ۲۹ کا مان لیا گیا اور اخبارات سے کہا گیا ایک روزہ عید کے بعد رکھ لیا

جائے۔ میں ۲۷ ویں شب میں کچھ عمل کیا کرتا لہذا میں مولانا کے پاس شعبۂ دینیات پہنچا اور دریافت کیا ایسی صورت میں ستائیسویں شب علی گڑھ مفتی کے فیصلہ پر تسلیم کروں یا دہلی اور ملک کے دیگر مقامات کے فیصلہ پر یعنی اکثریت پر۔ مولانا نے مجھے رویت کے مسائل سے ہٹ کر جغرافیہ، علم نجوم اور فلکیات کے اصول پر سمجھانا شروع کردیا، خاموشی سے سنتا رہا مگر جب نصف گھنٹہ سے زیادہ وقفہ گذر گیا تو میں اٹھا اور کہا السلام علیکم جناب! میں مولانا سمجھ کر آیا تھا آپ نے جغرافیہ اور نجوم پڑھانا شروع کردیا۔ باہر تیز قدموں سے نکل گیا۔ مولانا نے چپراسی کو دوڑایا، بلالیا مجبوراً واپس گیا دیکھا مولانا کمرہ سے باہر کھڑے ہیں مسکرا کر فرمایا ارے برامان گئے غصہ آگیا میں تو آزمارہا تھا خون میں کتنی گرمی ہے اور خسر کا اثر آیا کہ نہیں (میرے خسر صاحب بہت غصہ ور، نڈر، بیباک اور سخت مزاج تھے) پھر شفقت سے مسئلہ سمجھادیا اور یہ بھی کہا دونوں شب عمل کرلو تو زیادہ افضل ہوگا۔ پھر کمرہ سے باہر تک آئے خدا حافظ کیا۔ اللہ ان کے مرتبے بلند کرے، آمین۔

ایک بار ایسا ہوا، ڈاکٹر اسلم (لاہور، مولانا کے داماد) میرے پاس آئے اور بتا گئے کہ میں ایک جلد الوقوع از مولانا محمود عباسی امروہوی لایا ہوں! میں اتوار کی صبح مولانا کی رہائش پر پہنچ گیا، عرض کیا آپ کے پاس الوقوع ہے دے دیجیے ایک ہفتہ بعد انشاء اللہ واپس کردوں گا فوراً ناراض ہوگئے اور کہا کس بے وقوف نے تم سے کہا میرے پاس ہے میں نے آہستہ سے کہا حضرت جس نے لاکر دی وہ ہی کہہ کر آیا ہے مولانا کا مصنوعی غصہ غائب، فرمایا دیکھو میاں کتاب پر کسی سے یاری اور اعتبار نہیں رکھتا آپ گھر کے اندر تشریف رکھیں پڑھ لیں دوں گا نہیں! رخصت کرتے وقت تاکید کی بیٹا کسی سے بتانا نہیں!

ایک بار رمضان المبارک میں مولانا دھوپ میں بیٹھے تھے قریب ہی شیعہ عالم پروفیسر کامون پوری بیٹھے تھے! میں بھی چلا گیا تھا مولانا اکبرآبادی نے سنجیدگی سے کہا۔ مولانا آپ لوگوں نے فارسی اور اردو میں اپنا موقف اور نظریہ جس شدت اور بہتات سے لکھا اتنا سب کچھ انگریزی میں اس کا دس فیصد بھی نہیں لکھا۔ انہوں نے جواب دیا انگریز ہمارے دین پرنا کے برابر ہیں اس لیے نہیں لکھا اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ مولانا نے فرمایا میں سمجھتا ہوں اس لیے نہیں لکھا کہ انگریز تحریر اور تقریر سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ لکھے پر ازخود تحقیق کرتا ہے پھر قبول کرنے کی نوبت آتی ہے۔

غرض کہ مولانا سے اچھا واسطہ اور تعلق رہا بہت سے مسائل سمجھے معلومات حاصل کیں بحث بھی

ہوئی بہت دلچسپی سے باتیں کرتے اور شفقت فرماتے تھے۔ بہت سی اور بھی باتیں یاد ہیں۔

فقط والسلام

طالب دعا

ثاقب صدیقی

مکتوب قاہرہ

دارالعلوم کالج،
قاہرہ، مصر۔
۲۰۱۰/۱/۳ء

جناب محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی

السلام علیکم

مقالہ بھیج رہا ہوں اس کے ترجمہ میں پوری کوشش کی ہے کہ معارف کے معیار کے مطابق سلیس علمی زبان استعمال کروں، لیکن برائے مہربانی آپ اس کی تقویم کرکے اردویت کے تعلق سے جو کمی ہوا سے پوری کردیں، نیز اپنے ملاحظات اور تعلیقات سے مجھے بھی نوازیں۔

معارف کے حوالے سے ایک گزارش کرنا چاہتا تھا کہ مقالوں میں مذکور اقتباس شدہ نصوص چاہے وہ اصلی زبان میں ہوں یا مترجم ہوں، کو بین قوسین یا خط کشیدہ الفاظ کے تحت رکھنا زیادہ بہتر ہے، مزید یہ کہ ہوامش ہر صفحہ پر حسب النصوص مذکور ہوں تو قاری کو مضمون پڑھنے نیز متعلقہ ہامش کی طرف رجوع کرنے میں آسانی ہوگی۔

دعاؤں میں یاد رکھیں اور میری طرف سے جناب عبدالمنان ہلالی صاحب نیز سارے اسٹاف کو تحیہ وسلام عرض کریں۔

دعا گو

صاحب عالم

باب الاستفسار والجواب

تعلیم القرآن

میرے زیر مطالعہ ''تعلیم القرآن'' مولفہ مولانا محمد اویس ندوی ہے۔ میں جب اس کے ایک اندراج ''بدگمانی'' صفحہ ۲۳ پر پہنچا تو ایک عجیب سی خلجانی کیفیت سے دوچار ہو گیا۔ اس کی وجہ خط کشیدہ عبارت کے صحیح مفہوم تک عدم رسائی ہے:

''ایک مرتبہ رسول اللہؐ اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات کو آپؐ کی کوئی بیوی ملنے آئیں۔ آپؐ ان کو واپس پہنچانے چلے تو راستہ میں دو صحابی مل گئے''۔

معروضات:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں معتکف تھے؟ (۲) کیا معتکف (درحالت مسجد) کے پاس اس کی بیوی ملنے آسکتی ہے؟ (۳) کیا معتکف (درحالت مسجد) میں ملنے آنے والی بیوی کو گھر تک پہنچانے کے لیے جا سکتا ہے؟

برائے مہربانی رسول اکرم فداہ روحی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کے تاریخی پس منظر سے واقف کرا کر عنداللہ ماجور اور عندی مشکور ہوں۔ ایک اور سطر یہ بھی ہے جو فہم سے ماوراء ہے اور وہ یہ ہے ''جو شخص اس کو کھلے دل سے...... ہے'' صفحہ ۲۴۔ خالی جگہ میں مندرج لفظ کیا ہے؟ فقط

جویائے خیر۔ راجو خان
۷/ ۱۱/ ۲۰۰۹ء

معارف: یہ صحیح مسلم کتاب الآداب باب بیان انه یستحب لمن رأی خالیا بامرأة الخ کی روایت ہے، اس کے علاوہ قدرے اختلاف کے ساتھ یہی روایت بخاری کتاب الصوم باب الاعتکاف، باب هل یخرج المعتکف یدخل البیت لحاجته، ابوداؤد کتاب الصیام باب المعتکف یدخل البیت لحاجته کے تحت مذکور ہے۔

پہلا سوال کہ رسول اللہ کہاں معتکف تھے؟ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ مسجد نبوی کے علاوہ کسی اور مسجد میں آپؐ کے اعتکاف کی کوئی روایت تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکی، آپؐ کے مقام اعتکاف

کے متعلق ابن ماجہ میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ جب نبی کریمؐ اعتکاف فرماتے تو اسطوانة التوبہ کے پاس آپؐ کا بستر ڈال دیا جاتا اور چار پائی رکھ دی جاتی (باب فی المعتکف یلزم مکانا من المسجد ج دوم ص ۳۲، مطبوعہ دیوبند)، اسطوانة التوبہ، مسجد نبوی میں تھا جس کے متعلق محدثین نے لکھا ہے کہ اس ستون کو توبہ کا ستون اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایک صحابی لبابہ بن المنذرؓ نے اپنے آپ کو اس سے باندھ رکھا تھا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ مسجد نبوی میں ہی اعتکاف فرماتے تھے۔

دوسرے اور تیسرے سوال کے متعلق عرض ہے کہ بخاری، مسلم، ابن ماجہ اور ابوداؤد وغیرہ صحاح کی متعدد روایتوں میں ازواج مطہرات کا حالت اعتکاف میں آپؐ کی زیارت کے لیے مسجد جانا ہی نہیں بلکہ آپؐ سے بات چیت کرنا اور پھر آپؐ کا انہیں مسجد کے دروازے تک چھوڑ نا ثابت ہے، مذکورہ روایت بخاری میں تفصیل کے ساتھ یوں ہے:

''ام المومنین حضرت صفیہ فرماتی ہیں کہ'' حضورؐ رمضان کے اخیر عشرہ میں مسجد (نبوی) میں معتکف تھے، میں زیارت کے لیے خدمت اقدس میں حاضر ہوئی، تھوڑی دیر بیٹھ کر باتیں کر کے واپس ہونے کے لیے کھڑی ہوئی تو آپؐ بھی مجھے واپس کرنے کے لیے کھڑے ہوئے میں مسجد کے اس دروازے تک پہنچی تھی جو حضرت ام سلمہ کے دروازے کے پاس تھا کہ اتنے میں ادھر سے دو انصاری صحابی (اسید بن حضیر وعباد بن بشر) کا گذر ہوا، انہوں نے رسول اللہؐ کو سلام کیا، آپؐ نے فرمایا رک جاؤ، یہ صفیہ بنت حی ہے، صحابی بولے سبحان اللہ، آپ نے فرمایا شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑتا ہے، اس لیے مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں شیطان تمہارے دلوں میں کچھ فاسد خیال نہ پیدا کردے''۔

(کتاب الصوم باب المعتکف لحوائجه الی باب المسجد، ج۱ص ۲۷۲)

معلوم ہوا شوہر مسجد کے دروازے تک اسے چھوڑنے آسکتا ہے، دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف کی حالت میں ازواج مطہرات آپؐ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھیں (دیکھیے بخاری کتاب الصوم باب الاعتکاف، ج۱ص ۲۷۰) ہاں امام نووی کے مطابق لطف ولذت کی باتیں کرنے سے اعتکاف مکروہ ہوجاتا ہے (مسلم کتاب الآداب باب بیان انه یستحب لمن رأی الخ، ج۲ص ۲۱۶، کا حاشیہ ملاحظہ ہو)۔ البتہ مریض کی عیادت اور جنازہ میں شرکت کے متعلق فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

ک، ص اصلاحی

صفحہ ۲۴ پر صحیح لفظ ''لیتا'' ہے۔

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

مجلّہ اقبالیات: رئیس التحریر محمد سہیل عمر، کاغذ وطباعت عمدہ، صفحات: ۱۴۹، قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے، سالانہ: ۱۰۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی پاکستان، چھٹی منزل، اکادمی بلاک، ایوان اقبال ایجرٹن روڈ، لاہور۔

اقبال اکادمی کا یہ مشہور ترجمان ڈاکٹر علامہ اقبال کے افکار ونظریات کی مستقل تبلیغ وترویج میں ذمہ داری کے ساتھ مصروف عمل ہے، اس کا یہ شمارہ موضوعات کی اہمیت کے لحاظ سے خاص شمارہ نظر آتا ہے، زیرنظر شمارے میں علامہ اقبال کے تصور اجتہاد، تصور جمہوریت اور ان کی نظم ذوق وشوق کے علاوہ ان کے سوانح پر بہترین مضامین ہیں۔

علامہ اقبال کے تصور اجتہاد پر بحث ایک مستقل موضوع ہے، موافقت ومخالفت میں مسلسل اظہار خیال کا ایک طویل سلسلہ ہے، اس شمارے میں علامہ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے والد کے تصور اجتہاد کے متعلق کئی نکات پر بحث کی ہے جس سے بعض اشکالات کے ازالے کی راہیں بھی ہموار ہوسکتی ہیں، دوسرا مضمون علامہ کے تصور جمہوریت پر ڈاکٹر ایوب صابر کے قلم سے ہے اور کہنا چاہیے کہ یہ اقبال کی بہترین ترجمانی ہے جس میں بعض اعتراضات کے جواب بھی سلیقے سے آگئے ہیں، نظم ذوق وشوق کی تشریح وترسیل بھی خوب ہے، ایک اہم باب اقبالیاتی ادب کے عنوان سے ہے جس میں ماہنامہ قومی زبان میں اب تک شائع ہونے والے اقبالیاتی ادب کا مفصل اشاریہ آگیا ہے خود مجلّہ، دوسرے اہم رسائل کے اقبالیاتی ادب کا مستقل تعارف ومختصر تبصرہ پیش کرتا ہے، یہ سلسلہ اقبالیات کے شیدائیوں کے لیے بڑا معلومات افزا ہوتا ہے۔

ماہنامہ راہ اعتدال (رحمت عالم نمبر): مدیر مولانا حبیب الرحمان اعظمی عمری، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات: ۱۹۲، قیمت فی شمارہ: ۱۰ روپے، سالانہ: ۱۰۰ روپے، خصوصی شمارہ: ۴۰ روپے، پتہ: منیجر راہ اعتدال، جمعیت ابنائے قدیم، جامعہ دارالسلام، عمرآباد ۶۳۵۸۰۸، جنوبی ہند۔

راہ اعتدال جامعہ دارالسلام عمرآباد کی جمعیت ابنائے قدیم کا ترجمان ہے، اس کے دینی، اصلاحی اور دعوتی مضامین نے اس رسالہ کو واقعی اسم بامسمی بنادیا ہے، اس کے خصوصی شمارے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ زیرنظر شمارہ محسن انسانیت، نبی رحمتؐ کی حیات طیبہ کے ان پاکیزہ آثار کا گلدستہ ہے جن کی خوشبو سے آج بھی عالم انسانیت کی فضا عطر بیز و عطر آگیں ہوسکتی ہے اور جس کی ضرورت آج کی بے چین، بے راہ، بے لگام اور بے مقصد دنیا کو سب سے زیادہ ہے، جنگ، غارت گری، معاشی و سماجی استحصال، عدم مساوات اور روحانی کرب و اضطراب، دور جدید کے انسانی معاشرہ کے مسائل اور مصائب ہیں جن کی زد میں پوری دنیا ہے، اس سے نجات کی واحد صورت، اسلام اور پیغمبر اسلام کے کامل اسوہ اور لائق اتباع نمونے میں ہے، اس خصوصی شمارے کا مقصد بھی یہی ہے کہ آج کی انسانیت اپنے محسن اعظمؐ کو پہچانے۔ بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ''رحمت کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ کسی جاں بلب مریض کی جان بچالی جائے، ایک بچہ دم توڑ رہا ہے...... ماں رورہی ہے...... باپ مارا مارا پھر رہا ہے، سب بے بس معلوم ہوتے ہیں کہ اچانک ایک طبیب حاذق فرشتہ رحمت بن کر پہنچتا ہے اور کہتا ہے: گھبرانے کی کوئی بات نہیں، وہ دوا کا ایک قطرہ بچہ کے حلق میں ٹپکاتا ہے اور بچہ آنکھیں کھول دیتا ہے''۔ مولانا علی میاں، مولانا جلال الدین انصر عمری، مولانا عبدالعظیم عمری اور دیگر دوسرے مضمون نگاروں کی تحریریں دل کش ہیں اور پراثر بھی، ادارہ اس مبارک اشاعت اور نیک مقصد کے لیے مبارک باد کا مستحق ہے۔

سہ روزہ دعوت (خصوصی اشاعت جماعت اسلامی ہند کے ۶۰ سال): مدیر پرواز رحمانی، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات: ۲۵۰، قیمت: ۵۰ روپے، پتہ: دعوت، ڈی ۳۱۴، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

مشہور اخبار سہ روزہ دعوت وقتاً فوقتاً مسائل حاضرہ کی اہمیت کے پیش نظر خصوصی شماروں

کے ذریعہ اہم مقالات و مضامین اور معلومت کو پیش کرتا رہتا ہے، زیر نظر خصوصی شمارے میں جماعت اسلامی ہند کے ۶۰ سالہ مذہبی، علمی، ادبی، اصلاحی، سیاسی اور تنظیمی سفر کا ایک جامع مرقع پیش کیا گیا ہے، اس میں پندرہ مضامین میں گویا جماعت کے اکابر اہل قلم نے جماعت کے ماضی اور حال کی داستان جدو جہد ہی بیان نہیں کی، مستقبل میں جماعت کا طریق کار کیا ہو؟ ماضی کے تجربات اور عصری مقتضیات کی روشنی میں اس پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے، جماعت کے اراکین و متفقین اور ہمدردوں کے ساتھ مسلمانان ہند کی سیاسی و معاشرتی زندگی کی فکر رکھنے والوں کے لیے بھی پر از معلومات اور کارآمد ہے۔

مجلّہ المنار: مدیر عزیز احمد عبدالرشید، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۲۸۹، قیمت درج نہیں، پتہ: ندوۃ الطلبہ، الجامعہ السّلفیہ، بنارس۔

جامعہ سلفیہ بنارس کے طلبہ کی انجمن کے اس سالانہ ترجمان میگزین میں بیس سے زائد مضامین سولہ عنوانوں کے تحت جمع کیے گئے ہیں، موضوعات و مضامین سے ظاہر و ثابت ہے کہ جامعہ کے طلبہ میں درسی مصروفیات کے ساتھ مضمون نگاری پر توجہ دی جاتی ہے اور قرآن و حدیث کے ساتھ جدید مسائل پر بھی ان کی نظر ہے اور خیالات کو سلیقے سے پیش کرنے کی تربیت بھی ان کو حاصل ہے، اردو کے علاوہ عربی، ہندی، انگریزی زبانوں میں یہ مضامین طلبہ کے اچھے مستقبل کی نشان دہی کرتے ہیں۔

سہ ماہی اثبات: مدیر اشعر نجمی، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات: ۲۴۰، قیمت فی شمارہ: ۵۰ روپے، سالانہ: ۲۰۰ روپے، پتہ: اثبات اردو، پوسٹ بکس نمبر ۴۰، شانتی نگر، پوسٹ آفس میرا روڈ، ایسٹ ضلع تھانہ، مہاراشٹر، ۴۰۱۱۰۷۔

خالص ادبی رسالوں کی فہرست میں زیر نظر سہ ماہی رسالہ تازہ و نو وارد ہے لیکن اس کی اٹھان غضب کی ہے، زیر نظر شمارہ کئی بہترین ادبی مباحث اور بہترین شعری انتخاب پر مشتمل ہے، خوش ذوقی صفحے صفحے سے نمایاں ہے، گیبرئیل گارسیا مارکیز کا خصوصی مطالعہ بہت دلچسپ ہے، مشاہیر کے ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی جگہ دی گئی ہے اور یہ مایوس بھی نہیں کرتے، ملک کے مقتدر ادبی رسائل میں اگر بہت جلد اس رسالے کو نمایاں مقام حاصل ہو تو یہ حیرت کی بات نہیں۔

ت، ا، ندوی

ادبیات

غزل

جناب وارثؔ ریاضی صاحب

کوئی سرشارِ محبت نہ رہا میرے بعد
بند ہے مشغلۂ جور و جفا میرے بعد

تیرا ہر ناز بہ صد شوق اٹھایا میں نے
تو مگر بھول گیا ناز و ادا میرے بعد

یوں تو دنیا میں بہت اہل وفا ہیں پھر بھی
جانے کیوں تو نے مرا نام لیا میرے بعد

جرأت شوق نہ دیکھی گئی دیوانوں میں
گیسوئے حسن سنوارا نہ گیا میرے بعد

تیرے رخسار سے الجھے ہیں ترے دیوانے
احترامِ رخِ زیبا نہ رہا میرے بعد

کون رسوا سرِ بازار ہوا میری طرح؟
کس نے پائی ہے محبت کی سزا میرے بعد

اک مرے غم کا نہیں تھا کوئی دنیا میں علاج
لا دوا دردِ محبت نہ ہوا میرے بعد

میں کبھی یاد نہ آؤں گا کسی کو شاید
کون میرے لیے ترسے گا بھلا میرے بعد

جانے کیا بات ہے؟ وارثؔ کبھی دیکھا نہ گیا
وادی غم میں کوئی آبلہ پا میرے بعد

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار ۸۴۵۴۵۳۔

مطبوعات جدیدہ

ترکی اور اردو زبان کے مشترک الفاظ: از جناب اصغر حمید، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۵۲، قیمت: ۵۰۰ روپے، پتہ: اصغر حمید ایڈوکیٹ، حسن پور، پن کوڈ ۲۴۴۲۴۱، ضلع جیوتی با پھولے نگر، یوپی اور نیا سفر پبلی کیشنز، سی -۱۶۶ اووے وہار، فیز-۱ دہلی ۱۱۰۰۹۵ اور شاہد پبلی کیشنز، دہلی۔

گجری، دکنی، ہندی، ہندوی، لاہوری، دہلوی، ریختہ جیسے ناموں کے رد و قبول سے گزرتی ہوئی نئی ہندوستانی مخلوط زبان کو اردوئے معلیٰ اور پھر اردو کے نام سے قرار ملا، عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی کی جگہ زبان کی یہ پہچان اگر ایک ترکی لفظ میں ظاہر ہوئی تو حیرت اس لیے نہیں کہ سبکتگین سے قطب شاہی عہد تک ترکی النسل حکم رانوں کا دور دورہ رہا، تورانی زبانوں کے دوسری اور زبانوں سے اختلاط کا عمل و اثر بلغاریہ سے چین تک رہا، ہند آریائی زبان کا متاثر ہونا ایسا غیر فطری بھی نہیں تھا، زبان کا نام ترکی النسل ہونے کے باوجود عام خیال یہی ہے کہ اردو میں ترکی الفاظ کم شامل ہیں لیکن اس بیش قیمت کتاب کے فاضل مصنف نے قریب نو ہزار ایسے الفاظ جمع کر دیے ہیں جو ترکی اور اردو میں مشترک ہیں، مسلم یونیورسٹی میں وہ جغرافیہ کے طالب علم تھے روسی اور ترکی زبانوں کا شوق ہوا تو ترکی جا کر ترکی زبان کی تعلیم حاصل کی، اردو میں ترکی ادب کو روشناس کرایا اور اب پیرانہ سالی میں انہوں نے اس کتاب کی تالیف کا کارنامہ انجام دیا جس کے متعلق پروفیسر قمر رئیس نے صحیح لکھا کہ ''یہ علمی دیوانگی کا کرشمہ ہے'' واقعی یہ ایک فرد واحد کی غیر معمولی محنت ہے، ترکی زبان، الفاظ اور اردو سے اس کے رشتوں کے متعلق وقتاً فوقتاً کچھ تحریریں آتی رہتی ہیں لیکن دونوں زبانوں کے مشترک الفاظ کی تحقیق و تدوین پر ایسا وقیع اور بے نظیر کام پہلی بار ہوا اور یہ صرف الفاظ شماری تک محدود نہیں بلکہ اردو اور ترکی میں ان کے معنی و مفہوم اور اس سے بھی زیادہ ان الفاظ کے اصل ماخذ کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے، ان کا مقدمہ بھی بڑا عالمانہ ہے جس میں ترکی زبان کے تغیرات اور الفاظ کے مخارج کی وضاحت ہے اور ساتھ ہی اس زبان کی مختصر ترین لیکن جامع ترین تاریخ بھی آ گئی ہے، اس کتاب کے لیے وکالت کے پیشے کو خیر باد کہنا پڑا لیکن یہ تالیف ان کو ہمیشہ زندہ و آباد رکھے گی۔

گرد سفر: از جناب ملک تاسے، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۲۰، قیمت: ۱۶۰ روپے، پتہ: جھالا چیمبرز، پہلا منزلہ ۷ ۱۶-ایم جی روڈ، پونے، مہاراشٹر۔

اردو سفر ناموں کے سیاحوں میں ملک تاسے کا نام زیادہ معروف نہیں، سیاح سے پہلے وہ شاعر ہیں، درد نہاں کے نام سے ان کا ایک مجموعہ کلام چھپ بھی چکا ہے، پروفیسر عبدالستار دلوی نے ان کے تعارف میں

زبان وادب کے غیر معمولی ذہین اور وسیع المطالعہ طالب علم ہونے کا اعتراف کیا لیکن انکم ٹیکس کی دنیا سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کی ادبی صلاحیتوں کو وہ سازگار فضا نہ ملی جہاں ان کے پر پرواز کی آزمائش ہوتی لیکن ذوق جب رگ وریشہ میں سرایت کر جائے تو اس کی نمو ونمود کو روکا بھی نہیں جاسکتا، پہلے درد نہاں اور اب گرد سفر نے یہی ثابت کیا ہے، اس سفر کی مسافت میں کینیا، یونان، برطانیہ، ہالینڈ، بلجیم، جرمنی، دبئ اور امریکہ شامل ہیں یعنی ان کی سیاحت کا قبلہ مغرب ہی رہا، اس سفر نامہ کے لکھنے کا باعث دوستوں کا اصرار ہوسکتا ہے لیکن خود سیاح کو یہ احساس رہا کہ ماضی میں جتنے ہی سیاحوں نے دنیا کی بساط کو ناپنے کی کوشش کی اس کی بدولت انسان کا ذہنی افق بھی وسیع ہوا اور علم کی دنیا بھی وسیع تر ہوئی، تعجب ہے کہ اڑنے سے پہلے ہی جس کا رنگ زرد ہو جائے اس کی اڑان اس قدر دلچسپ اور نئے معلومات کا ذریعہ بن جائے، شاعر اگر سیاح بنتا ہے تو اس کی نظر کو فردوس نظر بننے سے روکا نہیں جاسکتا، افریقی ملک کینیا کے ذکر میں دامان باغباں وکف گل فروش اگرچہ قوسین میں ہے لیکن جب قوسین کے در وا ہوتے ہیں تو پھر معاملہ زبان بے نگہ اور نگاہ بے زباں میں کیسے بدلتا ہے یہ صرف پڑھ کر ہی معلوم ہوتا ہے، اک اجنبی دیار کی کسی تابندہ شام کی یادوں کے سایے میں انہوں نے اپنی نفسیاتی، سماجی، تعلیمی وثقافتی حتی کہ سیاسی شعور کو جس طرح تلاش کیا ہے وہ واقعی قابل داد ہے، وہ بغیر مرعوب ہوئے باتوں باتوں میں کہہ جاتے ہیں کہ برطانیہ کے باشندے ایک ہی مذہب یعنی مسیحی دین کے پیرو رہے ہیں مگر ان کے مختلف فرقے باہمی اختلافات کی بنا پر آپس میں دست وگریباں ہی رہے اور کسی حد تک آج بھی ہیں، امریکہ کے مجسمہ آزادی کو دیکھ کر یہ کہنا ان کی اصابت نظر کا ثبوت ہے کہ بیچارہ مجسمہ چپکے چپکے ضرور اپنی تقدیر کا ماتم کر رہا ہوگا، یہ امریکہ کے استعماری جنون کے شکار ملکوں کے دل کی آواز ہے۔ حالی، اقبال اور اردو وفارسی کے پاکیزہ اشعار اور خود سیاح شاعر کے جا بجا منظوم اظہار نے اس سفر نامہ کو دوآتشہ بنا دیا ہے، بالکل صحیح ہے کہ یہ سفر نامہ ایک ہمہ جہت شخصیت کا آئینہ ہے، کتابت کی غلطیاں کم ہیں لیکن سرِخم تسلیم نہیں ہونا چاہیے۔

مسلم پرسنل لا، زندگی کی شاہراہ: از مولانا منت اللہ رحمانیؒ، ترتیب مولانا ظفر عبدالرؤف رحمانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۳۲، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: دارالاشاعت، خانقاہ رحمانی، مونگیر، بہار۔

مسلمانوں کی انفرادی، عائلی اور معاشرتی زندگی میں شریعت کی ہدایات اور قوانین کی حیثیت روح کی ہے، اس کے بغیر مسلم معاشرہ جسد بے جان ہے، ہندوستان میں سیکولر آئین کے باوجود، مسلسل بنیادی حقوق کے عنوان سے اس روح کو نکالنے کی کوششیں ہوتی رہیں، اس کے سد باب کے لیے جن ہوش مند اور دور اندیش وعاقبت بیں حضرات نے پیش قدمی کی ان میں امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کا نام نمایاں ترین ہے، آل

انڈیا مسلم پرسنل لا کے قیام واستحکام میں مولانا رحمانی کی تحریریں اور تقریریں دلائل اور حسن مجادلہ کی خوبصورت تصویریں ہیں، یہ آج بھی نہایت موثر ہیں، اس کتاب میں یکساں سول کوڈ، متبنی بل، خاندانی منصوبہ بندی، نکاح وطلاق اور اسلامی اوقاف وغیرہ پر نو مضامین ہیں جو موضوع پر آج بھی مضامین نو ہیں، سلیقے سے ترتیب دی گئی اس کتاب کو خانقاہ رحمانی نے شائع کر کے امت کو ممنون منت بنا دیا۔

عربی اور اسلامی علوم وفنون کے گلاب عجم کے لالہ زاروں میں: مرتبہ پروفیسر محسن عثمانی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۸۰، قیمت: ۹۵ روپے، پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱، حوض سوئی والان، نئی دہلی۔

ایران بلکہ وسیع تر اصطلاح میں بلاد عجم نے اسلامی علوم وروایات کی حفاظت واشاعت کے لیے مرکز توانائی کی حیثیت پائی، خطہ ہند اس اجمال کی ایک مثال ہے جو بقول خوش مقال مرتب ایرانی ربط سے خوش حال، خوش جمال اور مالا مال ہوگیا، ایران کے سرمایہ لازوال کے اعتراف میں انہوں نے ایک سمینار کیا جس کے تین منتخب مقالات یعنی ایران کی عربی اسلامی میراث، عربی علوم وآداب کے ارتقاء میں ایران کا حصہ اور عہد وسطیٰ کے ایران میں اسلامی علوم وفنون کا ارتقاء بالترتیب علی قلی قرائی، پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی اور ڈاکٹر مظفر عالم کے قلم سے، اس کتاب میں یکجا کر دیے گئے، اپنے موضوع پر یہ تینوں مقالے سیر حاصل ہیں، معلومات کے چمن زار میں فاضل مرتب کا پر بہار مقدمہ موج صبا سے کم نہیں۔

نغمہ: از جناب نثار جیراج پوری، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۱۷۰، قیمت: ۱۲۰ روپے، پتہ: ۶۷-جالندھری، اعظم گڈھ۔

جناب نثار جیراج پوری ان سطور کے قارئین کے لیے محتاج تعارف نہیں، ان کے کلام کے کئی مجموعوں کا ذکر آچکا ہے، سہل ممتنع، نظر کی معصومیت اور لہجے کا حزن ان کے کلام پر دل نثار کرتا ہے، غزلوں کا یہ مجموعہ اگر قاری کی آپ بیتی بن جاتا ہے تو یہی اس کی سب سے بڑی خوبی اور کامیابی ہے، شاعر کا مرس کا مدرس ہے لیکن کلام کا رس قطعی وہبی ہے

دیکھ کر اپنی شکستہ موج کو ریت کی آنکھوں میں آنسو آگئے

بسی ہوئی ہے اک تہذیب میری فطرت میں میں شہر روم ہوں شیراز ہوں بخارا ہوں

ابر کے بازوؤں پہ سر رکھ کر چاند تنہائیوں میں روتا ہے

صحیح کہا گیا کہ جگہ جگہ انسانی مجبوریاں اور عقل وعشق کی نارسائیوں کا بیان نیا اور دلفریب ہے، ریت سمندر، جزیرہ، کبوتر، حویلی، کھنڈر، پھول تتلی اور شجر، پھاگن، بور اور سفر سب نے مل کر ایک سچا نغمہ بنا دیا، مسرت و انبساط کی اس سوغات کی قدر ہونی چاہیے۔ ع-ص